نصیر الدین ہاشمی

Title By : Ghulam Mustafa Daaim
PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دلی۔ 6

# دکھنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین

نصیر الدین ہاشمی

آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی ۶

بار اوّل

سنہ ۱۹۶۳ء

قیمت

مطبوعہ
یونین پرنٹنگ پریس دہلی

ناشر

آزاد کتاب گھر کلاں محل۔ دلّی ۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# حرفِ آغاز

اس کتاب میں میرے چند مضامین دکھنی (قدیم اُردو) ادب کے متعلق شامل ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں یہ مختلف رسالوں میں شائع ہوئے تھے، اُن پر نظرِ ثانی کر کے کمی اور اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

میرے مضامین میں عمق اور گہرائی نہیں ہوتی، اور نہ رنگینی، لطافت، دلچسپی یا دلکشی تلاش کی جائے تو کامیابی ہوگی۔ میں سطحی طور پر اپنی تحقیق پیش کرنے کا عادی ہوں۔ چونکہ ریسرچ اسکالروں کے لئے یہ مضامین مفید ہو سکتے ہیں۔ اس لئے اس کتاب میں اُن کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔

اس کی اشاعت کے لئے میں جناب معزالدین صاحب مالک آزاد کتاب گھر (دلی) کا ممنون ہوں جن کی دلچسپی سے یہ مجموعہ منظرِ عام پر آرہا ہے۔

رمضان ۱۳۸۲ھ
جنوری ۱۹۶۳ء
حیدرآباد - آندھرا

نصیر الدین ہاشمی

# فہرست مضامین


۱۔ قدیم اُردو یا دکھنی ادب کے موضوع ۹

۲۔ قدیم اُردو (دکھنی) میں سیرۃ النبی کا ذخیرہ ۲۴

۳۔ قدیم اُردو کے قصص انبیاء ۵۱

۴۔ قدیم اُردو (دکھنی) میں نیچرل شاعری ۶۸

۵۔ سلطان علی عادل شاہ ثانی اور اُس کی اُردو شاعری ۸۷

۶۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کی اُردو شاعری ۱۰۵

۷۔ اُردو میں لیلیٰ مجنوں کی داستانیں ۱۳۵

۸۔ محمد حنیفہ کے متعلق منظوم داستانیں ۱۶۱

۹۔ اُردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ لطف النساء امتیاز کا دیوان اور مثنوی گلشن شعراء ۱۷۶

# قدیم اُردو یا دکھنی ادب کے موضوع

میں نے اپنی کتاب "دکن میں اردو" میں تفصیل کے ساتھ دکن میں اُردو کے آغاز سے بحث کی ہے۔ یہاں اس کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہمنی دور یعنی سنہ ۱۵۰۰ء سے یہاں قدیم اردو یا دکھنی کا نشو و نما ہونے لگا اور تقریباً نصف صدی کے بعد اس کو ادبی صورت حاصل ہوئی۔

دکھنی دور (سنہ ۱۷۰۰ء) تک قرار دیا جاتا ہے۔ یہ زمانہ ہماری تقسیم کے لحاظ سے تقریباً تین ادوار میں منقسم ہے۔ لہٰذا ہم اسی لحاظ سے دکنی ادب کی صراحت کریں گے۔

دکن میں دکھنی نظم اور نثر کے ابتدائی نمونے خواجہ بندہ نواز سیّد محمد حسینی گیسو دراز کے ملتے ہیں جن کا انتقال ۸۲۵ھ میں ہوا۔ آپ ۸۱۵ھ میں دکن آ کر بس گئے تھے۔ خواجہ صاحب کی دکھنی تصانیف تصوّف سے متعلق ہیں۔ آپ کے چند رسالے معراج العاشقین اور بارہ ماسہ کے سوا اب ہم آپ کی دوسری تصانیف یعنی شکار نامہ اور تلاوت الوجود وغیرہ کا بھی تعارف کرا سکتے ہیں۔ یہ بھی تصوّف کے رسالے ہیں اور نواب سالار جنگ کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

خواجہ صاحب کی نظمیں مختلف بیاضوں میں ہیں۔ یہ نظمیں "حقیقت" کے عنوانوں سے لکھی جاتی تھیں اور اُن کی صورت مسدّس کی سی ہے۔ اس میں بھی تصوّف ہی کا بیان ہے۔

خواجہ صاحب کے علاوہ آپ کے فرزند سیّد اکبر حسینی اور پوتے سیّد عبداللہ حسینی، ایک اور بزرگ شیخ صدرالدین چشتی وغیرہ کی کتابیں موجود ہیں جو تصوّف ہی کے عنوان پر مشتمل ہیں۔ تصوّف کے ساتھ اس دور میں عشقیہ مثنوی بھی لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی کا مصنّف نظامی شاعر ہے جو بہمنی دور سے ہی تعلّق رکھتا ہے۔ اس کی یہ طبع زاد مثنوی "کدام راؤ و پدم" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ کسی فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے۔ اس طرح پہلے دور میں صرف دو موضوعات کا پتہ چلتا ہے۔ دکنی ادب کا دوسرا دور ۹۰۱ھ سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں ہم کو ادب کے کئی ایک موضوعات پر کتابیں ملتی ہیں۔ اس دور کی نظم و نثر کا جو ذخیرہ ہے اُس کو کئی عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً

(۱) مذہب (۲) تاریخ و سوانح (۳) مرثیہ اور شہادت نامے (۴) رزم نگاری (۵) بزم اور معاشرت نگاری (۶) نیچرل شاعری (۷) عشق و محبت۔

**مذہب** مذہب کا موضوع نہایت وسیع ہے۔ اس میں تصوّف۔ اخلاق، پند و نصائح، فقہ اور عقائد کے سوا معراج نامے۔ مذہبی قصّے اور قصصِ انبیاء وغیرہ داخل کیے گئے ہیں۔ اس قسم کا ذخیرہ جو نظم و نثر پر مشتمل ہے اس کی تقریباً ایک سو کتابیں اب تک دستیاب ہو چکی ہیں۔

**تصوّف** تصوّف کے سطحی اور عمیق دونوں قسم کے مسائل کو ان کتابوں میں حل کیا گیا ہے۔ انسانی رُوح کی صفائی اور تزکیۂ نفس کی اچھی طرح تشریح کی گئی ہے۔ خیالاتِ باطل اور اخلاقِ فاسد کے دُور کرنے کے طریقے بتائے ہیں۔ تسکین اور اطمینانِ قلب کے گُر درج کیے گئے ہیں۔ انسان کو اللہ سے لَو لگانے، رسولؐ اور پیر سے محبّت کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔

**اخلاق پند و نصائح** مذہب کا دوسرا شعبہ اخلاق اور پند و نصائح ہے۔ اس قسم

کی کئی ایک قلمی کتابیں دکھنی ادب میں موجود ہیں۔

پند و نصائح کی کتابیں زیادہ تر وہ ہیں جو فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔

**فقہ و عقائد**

اس دور میں فقہ اور عقائد کے عنوان پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، فرض، سنّت، واجب، طہارت اور پھر سنّت جماعت کے عقائد، قیامت، جنّت، دوزخ، روزِ محشر، قضا و قدر، سوال و جواب وغیرہ امور کو اکثر کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔

**مذہبی قصّے**

معراج نامے، قصص انبیاء، دوسرے انبیاء کے قصّے مثلاً یوسف زلیخا، قصّہ حضرت موسیٰؑ۔ قصّہ حضرت خاتونِ جنّتؓ، وفات نامے وغیرہ بھی اسی دور میں ملتے ہیں۔ ان قصّوں میں جھوٹ سچ سب کچھ شامل ہے۔ اکثر معراج ناموں کو قصّوں کے پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ معراج ناموں میں سب سے ضخیم معراج نامہ ممتاز کا ہے۔ اس کے تین ہزار سے زیادہ شعر ہیں اور ۱۰۹۲ھ میں قلمبند ہوا ہے۔ دوسرا قابلِ ذکر معراج نامہ بلاقی کا ہے جس طرح معراج ناموں کو قصّوں کے طرز پر لکھا گیا ہے اسی طرح قصص انبیاء میں قصّے ہیں۔ ان میں خصوصیت سے قدرتی کی مثنوی قصصِ انبیاء قابلِ ذکر ہے۔ اس کے صرف ایک ہی نسخے کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ باوجود ناقص الآخر ہونے کے دس ہزار سے زیادہ شعر ہیں قصص انبیا اور یوسف زلیخا وغیرہ کو ترتیب دینے میں دکنی شعرا نے عربی تفسیروں سے بھی مدد لی ہے اور فارسی قصّوں کو بھی ماخذ بنایا ہے۔

**تاریخ و سوانح**

اس دور میں تاریخ اور سوانح کا موضوع بھی دکنی ادب کا ایک شعبہ رہا ہے۔ اس عنوان میں خصوصیت سے عبدل کا ابراہیم نامہ، فیروز کا توصیف نامہ۔ نصرتی کا علی نامہ اور تاریخ اسکندری، افضل کا محی الدین نامہ خصوصیت سے قابلِ تذکرہ ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ان تاریخوں اور سوانح عمریوں میں تنقیدی اصول پر کام نہیں
ہوا ہے بلکہ مناقب کی صورت اختیار کی گئی ہے۔ لیکن نصرتی نے واقعہ نگاری کا
جو حق ادا کیا ہے وہ درحقیقت اردو زبان کے لئے قابلِ فخر ہے۔ عام طور پر انیس
کے مرثیوں کو واقعہ نگاری کے لحاظ سے ترجیح دی جاتی ہے۔ مگر علی نامہ کے مطالعے
کے بعد اس کی خوبی کا اعتراف ناگزیر ہو جاتا ہے۔ عبدل کے ابراہیم نامہ میں اگرچہ
تاریخی امور زیادہ نہیں ہیں مگر پھر بھی جو باتیں ظاہر کی گئی ہیں وہ عام تاریخوں میں نہیں
ملتیں۔ اس لئے اس کی افادیت واہمیت زیادہ ہو جاتی ہے۔

شمالی ہند میں جس طرح خواجہ معین الدین اجمیری کے معتقدین زیادہ پائے جاتے
ہیں اسی طرح دکن میں قدیم زمانے سے سید عبدالقادر جیلانیؒ سے زیادہ اعتقاد
رہا ہے۔ قدیم دکنی ادب میں حضرت جیلانیؒ کے مناقب اور کرامات وغیرہ کا ذخیرہ
بہت زیادہ ملتا ہے۔ فیروز کا توصیف نامہ اور افضل کا محی الدین نامہ اس سلسلے
کی ابتدائی کتابیں ہیں۔

### شہادت نامے

اکثر سلاطین دکن شیعہ مذہب کے پیرو تھے۔ اس لئے اُن کے
یہاں مجالسِ عزا کا خاص دستور تھا۔ اولاً تو محتشم کاشی
کے فارسی بند پڑھے جاتے تھے۔ مگر چونکہ دکنی شاعری مقبول ہوتی جا رہی تھی۔
اس لئے مرثیوں اور شہادت ناموں کے لکھنے کا بھی رواج ہو گیا۔

اب تک دریافت شدہ دکنی ادب میں اشرف کا "نوسرہار" پہلا
شہادت نامہ ہے جو احمد نگر میں ۹۰۹ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد احمد کی
مثنوی "مصیبتِ اہلِ بیت" ملتی ہے۔ رام راؤ سیوا نے جو شہادت نامہ لکھا تھا
وہ "روضۃ الشہدا" کے نام سے موسوم تھا۔ مگر افسوس ہے اب تک کسی کو یہ ہمدست
نہیں ہوا۔ لطیف اور سیوک کی کتابیں بھی اسی نوعیت کی ہیں اور خاصی ضخیم ہیں۔

ان شہادت ناموں کے علاوہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے کئی ایک شعراء کے مرثیے ہیں جن میں طویل مرثیے سو سو سے زیادہ شعر کے بھی ہیں۔ ان میں شہادت امام حسینؓ اور شہدائے کربلا کے متعلق نہایت سوز و گداز سے اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ آج تک کوئی مجموعہ مرتب نہیں ہوا۔ اگر یہ مرتب ہو جائے تو ضخیم مجموعہ بن سکتا ہے۔

**رزم نگاری** اس دور کے ادب کا ایک جز رزمیہ مثنویاں ہیں۔ دکنی شعرا نے نہ صرف خاص رزمیہ مثنویوں میں رزم کے حالات لکھے ہیں۔ بلکہ دوسری عشقیہ مثنویوں میں بھی رزم نگاری کا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ یوں تو کئی مثنویاں قابلِ تذکرہ ہیں مگر ہم صرف تین کا یہاں تعارف کراتے ہیں۔

۱۔ خاور نامہ ——— ابن حسّام کے فارسی خاور نامہ کا ترجمہ ہے۔ کمال خاں المتخلص بہ رستمی نے خدیجہ سلطان شہر بانو ملکہ محمد عادل شاہ کے حکم سے ۱۰۵۹ھ میں صرف ڈھائی سال کی مدت میں ۲۴ ہزار اشعار کی یہ مثنوی دکنی میں منتقل کی ہے۔ اس میں ایک فرضی داستان حضرت علیؓ اور آپ کے رفقا کی بیان کی گئی ہے۔ جو داستانِ امیر حمزہ کے طور پر لکھی گئی ہے۔ اس میں ابتدا سے آخر تک جنگوں، لڑائیوں وغیرہ کا ذکر ہے بّری جنگ، بحری جنگ، شب خون، قلعہ کا محاصرہ اور فتح، بہادروں کا مقابلہ، تمام واقعات کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس مثنوی سے شاعر کی قادر الکلامی کا ثبوت ملنے کے علاوہ قصّہ کا سلسلہ بیان بھی قابل تعریف ہے۔ اس کا کوئی نسخہ اب تک ہندستان اور دکن میں نہیں ہے۔ صرف ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

۲۔ علی نامہ ——— نصرتی کا شاہکار ہے۔ اس میں علی عادل شاہ ثانی کے معرکوں کی روئداد ہے۔ علی نامہ ۱۰۷۶ھ میں لکھا گیا ہے۔ علی عادل شاہ ثانی کے

عہد میں مرہٹوں، مغلوں اور سلطنت کے باغی سرداروں کے ساتھ جو معرکے ہوئے اور دیگر فتوحات کا بیان نصرتی نے نہایت چابک دستی سے کیا ہے۔ واقعہ نگاری کا جو حق ادا کیا ہے وہ عجوبہ ہے۔ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ فوجوں کی روانگی، بہادروں اور سورماؤں کا مقابلہ، رسالوں اور ہاتھیوں کی مڈبھیڑ، ہنگامہ کارزار کی گرم بازاری، جنگ و پیکار کی روئداد، شمشیر و سناں کی مصروفیت، ہتھیاروں کی جھنکار، توپوں کی گرج، دار و گیر کی تفصیل۔ غرض جنگ کی خونچکاں داستان نہایت شرح و بسط سے لکھی ہے۔

۳۔ فتح نامہ نظام شاہ —— اس مثنوی میں جنگ تلی کوٹ کا حال لکھا گیا ہے جو دکن کے چاروں بادشاہوں اور وجیانگر کے راجہ میں ہوئی تھی۔ دکن کی وہ لڑائیاں جس میں سلطنتوں کی قسمتوں کا فیصلہ ہوا ہے اُن میں سے ایک جنگ تلی کوٹ بھی ہے۔ اگرچہ وجیانگر کی سلطنت نے دکن کی متحدہ حکومت پر حملہ کیا تھا متحدین کی فوج سازوسامان۔ تعداد فوج وغیرہ کے لحاظ سے وجیانگر کے برابر نہیں تھی۔ اس کے علاوہ وجیانگر کے پاس ہاتھیوں کا ایک عظیم الشان لشکر تھا جس نے دکنی لشکر کو روند ڈالا۔ قریب تھا کہ مہاراجہ کو فتح ہو جائے۔ مگر عین موقع پر مہاراجہ کے مارے جانے سے جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا اور دکنی سلاطین فتح یاب ہوگئے وجیانگر کا لشکر فرار ہو گیا اور سلطنت وجیانگر کے حصّے بخرے ہو گئے۔

اس عظیم الشان جنگ کا حال فتح نامہ نظام شاہ میں قلم بند کیا گیا ہے۔ دکن کی اکثر عشقیہ مثنویوں میں جنگ و جدل کا حال ضرور ملتا ہے اور اس کے مصنف روئدادِ جنگ کافی سلیقہ سے بیان کرتے ہیں۔ اس طرح جنگ نامہ سیدی اور ظفر نامہ رطیف میں جنگ و پیکار کی داستان جگہ جگہ آتی ہے۔

بہر حال اس دور میں رزمیہ مثنوی نے دکنی ادب میں خاص مقام بنا لیا تھا۔

**بزمِ آرائی اور معاشرت** جس طرح رزمیہ مثنویاں اس دور کے ادب کا ایک قابلِ قدر حصّہ ہیں۔ اسی طرح بزمی امور اور اس وقت کے معاشرتی اور سماجی حالات کے متعلق بھی کئی مثنویاں اور نظمیں ملتی ہیں۔ شوقی کا 'میزبانی نامہ' ایک طویل مثنوی ہے جس میں نظام شاہ کی شادی کا حال قلمبند ہوا ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے کئی مثنویاں اور نظمیں، عیدیں، سالگرہ، نوروز، رسوماتِ شادی بیاہ کے لوازماتِ شاہی اور کھیل کود وغیرہ امور پر لکھی ہیں جو ہر حیثیت سے قابلِ قدر ہیں۔ ان میں واقعہ نگاری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

**نیچرل ادب** نیچرل شاعری یا فطری شاعری اس کو کہتے ہیں جن میں مناظرِ قدرت پر خیال آرائی ہو۔ ولی کے بعد اور حالی کے پہلے تک اس قسم کی شاعری کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ مرثیوں میں واقعہ نگاری کا ذخیرہ ہمدست ہوتا ہے۔ پھر میر حسن یا نظیر اکبرآبادی کے پاس اس قسم کا مواد موجود ہے۔ دکنی ادب کی یہ خصوصیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اس میں نیچرل شاعری کا خاصہ ذخیرہ ہے۔ خصوصیت سے سلطان محمد قلی، نصرتی اور شاہی وغیرہ نے اس قسم کا ادب پیش کیا ہے۔

قطب شاہ کی شاعری میں منظر نگاری اور واقعہ نگاری کا بہت زیادہ حصّہ ملتا ہے۔ اُس نے نیچر کے متعدد مظاہر کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اسکی کلّیات میں موسم بارش، سرما، بسنت، نوروز، ہلالِ عید، ترکاری، پھول پھل، سالگرہ۔ عیدِ غدیر۔ مولود نبی۔ محرّم۔ چوگان بازی۔ پھکڑی پہو وغیرہ عنوانات پر مثنویاں اور نظمیں ملتی ہیں۔ سلطان قلی نے ایک ہی موضوع پر مختلف ہنج سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ مثلاً موسم بارش، نوروز، بسنت، عیدین وغیرہ کی نظمیں دیکھی جا

تو اس کے جدتِ تخیل کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ سلطان محمد قلی کی نظموں سے نہ صرف منظر نگاری کا کمال ظاہر ہوتا ہے بلکہ اس وقت کے تمدن، معاشرت اور تہذیب کے متعلق بھی بہت ساری باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اُس نے نیچرل ادب کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے وہ نہایت عمدہ اور گراں قدر ہے۔ اس کے کلام میں ایسے ایسے نگینے موجود ہیں جن کی آب وتاب کبھی زائل نہیں ہو سکتی۔

نصرتی نے اپنی مثنوی گلشنِ عشق میں جو اگرچہ ایک عشقیہ مثنوی ہے، باغ کے منظر۔ صبح کے سماں۔ چاندنی کی کیفیت کشتی کی روانی، سردی کا حال۔ تمازتِ آفتاب وغیرہ امور کو جس طرح واضح کیا ہے وہ منظر نگاری کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اُس نے علی نامہ میں شہر کی آرائش وزیبائش۔ بادشاہ کی سواری اور تخت نشینی جشن کی کیفیت، رعایا کی خوش حالی۔ چراغوں کی کثرت۔ جلسوں کی روئداد پھر موسم سرما کی وضاحت، سردی کی شدّت۔ شبنم کی کیفیت۔ باغوں کی حالت، گل وگلشن کی پژمردگی کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ یہ سب نیچرل شاعری یا نیچرل ادب کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے دکھنی شعراء کی مثنویوں میں نیچرل ادب کا کافی سرمایہ ملتا ہے۔ صبح وشام۔ طلوعِ آفتاب۔ رات کی تاریکی جنگل بیابان۔ موسم بارش۔ موسمِ بہار۔ ایوان قصرِ شاہی محل۔ باغ گلشن۔ خیابان۔ پھول پھل۔ ضیافت وغیرہ کا کثیر مواد موجود ہے۔

**جنسی ادب** موجودہ دور میں جنسی ادب بھی اردو ادب میں نمایاں مقام حاصل کر چکا ہے۔ دکھنی ادب کے اس دور میں بھی ہم کو ایک کتاب جو بیدر کے برید شاہی عہد میں قریشی نے "بھوک پھل" کے نام سے لکھی ہے ملتی ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ میں اس کا ایک مصوّر نسخہ موجود ہے۔

**عشقیہ ادب** اب ہمیں اس دور کے عشقیہ ادب کا جائزہ لینا ہے۔ دکھنی شعراء اور نثر نگاروں نے عشقیہ ادب کو فارسی سے ترجمہ بھی

کیا ہے اور اپنی اچھی تخیلات کو بھی الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ اب تک جو دکھنی عشقیہ مثنویاں ہمدست ہوئی ہیں اور جو نثر کے قصے معلوم ہوئے ہیں اُن کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔ ان میں ہم مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔ اب عشقیہ مثنویوں کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔

عشقیہ قصے اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ عاشق اپنے معشوق کو کہیں دیکھ پاتا ہے خواب میں یا تصویر میں یا کسی قصہ میں۔ اس کے بعد اس کی تلاش میں روانہ ہوتا ہے۔ مصیبتوں میں مبتلا ہوتا ہے ظلم و ستم برداشت کرتا ہے اور جنگ و جدل کے بعد کامیاب واپس ہوتا ہے۔ اس طرح عشقیہ داستانوں میں ایک طرف بزم کی لطف انگیز اور رنگین داستان ہوتی ہے تو دوسری طرف جنگ و جدل اور معرکہ کارزار کی خونچکاں حکایت بھی مل جاتی ہے۔ ان قصّوں سے اس زمانے کی معاشرت، رسم و رواج کا بھی پتہ لگ جاتا ہے۔ اکثر قصے اپنے زمانے کی پوری تصویر پیش کرتے ہیں۔

ایک اور بات بھی پیشِ نظر ہے کہ اسلام کی خدمت بھی ان لوگوں کا نصب العین رہا ہے، وہ کسی نہ کسی صورت سے لوگوں کو اسلام کی جانب مائل کرتے نظر آتے ہیں۔

دکنی ادب میں عشق و محبّت کا جو ذخیرہ ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ اس میں قصّہ کا پلاٹ بہت سلیقے سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ کردار نگاری کے جوہر ملتے ہیں حسن ترتیب، کیرکٹر کا اتحاد، واقعات کا تسلسل اور ربط وغیرہ امور پائے جاتے ہیں یعنی یہ کہ شاعر کو جو مسالہ ملتا ہے وہ غیر مربوط ہوتا ہے۔ وہ اس کو ترتیب دیتا اور موقع و محل سے تخیل کو کام میں لاتا ہے جذبات میں اثر پیدا کرتا ہے۔ یہ سب حسنِ ترتیب ہے۔ قصہ میں جن اشخاص کا تذکرہ ہوتا ہے اُن کے کردار کا لحاظ ضروری ہے۔ مرد۔ عورت، بچے۔ جوان۔ بوڑھے۔ امیر، غریب، بادشاہ، رعایا، سوداگر اور فقیر۔ عالم اور جاہل، سپاہی اور تاجر غرض ہر ایک کا کردار

علیحدہ ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کا فرض ہے کہ وہ ان کا لحاظ رکھے اور خصوصیتیں قائم کرے اور پھر جن اشخاص کا ذکر ہے اُن کا کردار قائم اور برقرار رکھے۔ واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ واقعہ کا اظہار ایک ماہرِ فن مصوّر کی حیثیت سے کرے۔ نہ صرف اصل خصوصیات بلکہ جزئیات کو بھی نظر انداز نہ ہونے دے۔

اس معیار سے دکنی ادب کو جانچا جائے تو ناکامی نہیں ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ دکنی ادب کی سب کتابیں ان تمام خصوصیات کی حامل نہیں ہیں۔ وہ انفرادی حیثیت سے خامیاں بھی رکھتی ہیں لیکن چونکہ یہ قدیم اردو کی ابتدائی کدوکاوش کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے اُن کے تخیلات اور کام کی قدر نہ کرنا اور آج کل کے معیار سے جانچا جانا صحیح نہ ہوگا۔

اس تفصیل کے بعد ہم دکن کے تیسرے دور کی طرف آتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ عالم گیر نے گولکنڈہ اور بیجاپور کو فتح کرلیا تھا اور مغلوں کی حکومت دکن کے وسیع حصّہ پر اپنے سطوت و جبروت کا ڈنکا بجانے میں مشغول تھی۔ دکن پر نہ صرف صوبہ داروں کی حکومت تھی بلکہ اورنگ آباد خجستہ بنیاد سے ملقب ہوکر شمال اور دکن کا دارالسلطنت بن چکا تھا۔ بیجاپور اور حیدرآباد کے شعراء اور ادیب اپنے وطن کو خیرباد کرکے اورنگ آباد میں جمع ہوگئے تھے اور پھر دہلی کے اصحابِ علم وفضل اس شہر کو علم و ادب کا سنگم بنا چکے تھے۔

تیسرا دور

اس دور میں غزل کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے موضوع بھی ادب میں شامل ہوگئے۔ مثلاً مذہبی ادب میں قرآن شریف کے ترجمے، تفسیریں بھی لکھی گئیں۔ آں حضرت پیغمبرِ اسلام کی سیرت اور شمائل کا حصّہ دکنی ادب میں شامل ہوگیا۔

اس دور میں جہاں اس قسم سے ادب کی کئی شاخوں میں توسیع ہوئی وہاں بعض قدیم شعبوں میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ سکوت رہا اور ٹھہراؤ پیدا ہوگیا۔
آج سے پہلے جن شعرا اور ادیبوں کے کارناموں سے مورخین ادب واقف تھے ان میں بہت کچھ اضافہ ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر عبدالحمد کا شمائل نامہ، محبوب عالم کا دردنامہ۔ راجی کا نامہ علی۔ فراقی کی مراۃ الحشر۔ ولی ویلوری کی روضتہ الانوار۔ روضتہ العقبیٰ۔ مومن کی اسرارِ عشق وغیرہ زیادہ کی جاسکتی ہیں۔ ان سب کے قلمی نسخے کتب خانہ جات دکن کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

**تبصرہ**

اس تفصیل سے آپ کو تقریباً چار سو سال کے ادب کا حال معلوم ہوسکتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی قابلِ تذکرہ ہے کہ اُس زمانے کا ماحول کیا رہا۔ اور کن حالات اور کن خیالات میں دکھنی ادب بنتا رہا۔ پروان چڑھتا رہا۔ دکن میں جس وقت ادب کا آغاز ہوا اُس وقت بہمنی حکومت قائم تھی سلطنت مستحکم ہوچکی تھی۔ نظم ونسق اچھا تھا۔ علماء اور صوفیا کی قدردانی ہوتی تھی صوفیائے کرام اور اولیائے عظام وعظ ونصیحت، ارشاد اور ہدایت کا کام انجام دے رہے تھے۔ علمار فن اپنے درس وتدریس میں مشغول تھے۔ ایک طرف یہ تبلیغی کام ہو رہا تھا دوسری طرف سلطنت مستحکم ہونے کے سوا ملک گیری کی ہوس غالب رہی سیاسی فضا مکدر ہوتی رہی۔ خون کے بادل منڈلاتے رہے۔ بہمنی حکومت اپنے ہمسایہ حکومتوں سے نبرد آزما ہوتی تھی۔ اس کے بعد جب ایک کے بجائے پانچ سلطنتیں بن گئیں تو ان میں آپس میں ہمیشہ جنگ وجدل ہوتا رہا۔ اس کے بعد مغلوں کے حملے شروع ہوگئے۔ خود دکنی آپس میں لڑتے رہے۔ مرہٹوں اور راجپوتوں سے معرکے رہے۔ غرض اس سے واضح ہے کہ دکھنی یا قدیم اردو ادب تمام تر خونی فضا میں پرورش پایا یا پھر دولت کی فراوانی عیش وعشرت کی گرم بازاری رہی۔ نغمہ اور

سرور اور طرب و نشاط کا دور دورہ رہا۔ موسیقی کی قدردانی، اربابِ موسیقی کی سرپرستی ہوتی رہی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی کوئی تقریب خواہ وہ مذہبی ہو معاشرتی بغیر طوائف کے مکمل نہیں ہوتی تھی۔ ہر طرف بزمِ عیش و طرب برپا رہا کرتی، ساقیانِ ہوش اور زاہد فریب رانیاں صحبت کو گرماتی تھی۔ اس وقت کی عام معاشرت میں سادگی۔ بلند مشربی۔ عالی دماغی کا وجود نابود ہونے لگا تھا۔ تمدّن اور معاشرت میں تکلف تھا۔ عالی شان عمارات کی زیبائش اور آئینہ بندی اور آراستگی اور جنت نظر باغوں۔ فردوسی منظر گلزاروں کی چمن بندی اور گلشن آرائی میں بے دریغ روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ ان عالی شان ایوانوں عظیم الشان محلوں۔ رشکِ ارم خیابانوں میں خوبی اور رعنائی حسن و دلربائی اور زیبائش کے مجسّم پیکروں۔ گُل رخسار حور پری چہرہ بیگموں کے کرشمہ و ادا اور ناز و غمزہ کی سحر آفرینی سے آنکھوں پہر لطف اندوز ہونے کا موقع رہتا تھا۔ زر کی قلت مگر جنس کی ارزانی تھی۔ ایک دو روپیہ میں خاندان کی پرورش ہوتی تھی۔ غرض کہ یہ تھا وہ ماحول جس میں دکنی ادب یا قدیم اردو ادب پروان چڑھا۔ دکھنی ادیبوں کے کارناموں کے متعلق یہ دیکھنا ہوگا کہ انھوں نے جس کام کا آغاز کیا تھا اس کو کس طرح معراج پر پہنچایا۔ انھوں نے قدیم اردو نظم و نثر کو ترقی دے کر کیا کیا گُل بُوٹے پیدا کئے۔ باغِ اُردو کی آبیاری کر کے اس چمن کو کس طرح تر و تازہ اور گل و گلزار سے آراستہ کر دیا۔

انھوں نے ادب کی مختلف شاخوں کو اپنے افکار کی جولاں گاہ بنایا۔ انھوں نے ہر نوع کے ادب کو ترقی دے کر اپنا مقام اور جگہ بنالی۔ بازاری بول چال کو تصوّف اور مذہب کے بیش قیمت اور باریک نکات اور رمز کو سمجھانے کا ذریعہ بنایا۔ تاریخ اور سوانح کے گراں قدر نمونے پیش کئے۔ فلسفے کو اپنایا۔ اخلاق کے خوش نما پھول

بھی کھلائے۔ نیچرل امور پر خامہ فرسائی کی عشق و محبت کی رنگین داستانوں کو ادب میں بلند جگہ دی۔ قدرت کی منظر نگاری اور معاشرتی امور کی عکاسی کی رزم کی خونچکاں حکایت نظمائی بزم کی طرب انگیز داستان سنائی۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ قدیم اردو کے ادیبوں نے فارسی ادب کو ماڈل قرار دیکر اور قدیم سنسکرت کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے ادب کا آغاز کیا تھا۔ انھوں نے نہ صرف فارسی شعراء اور ادیبوں کے موضوعات کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے ادب کو پروان چڑھایا بلکہ جدید موضوع بھی پیدا کئے۔ یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ دکنی ادیبوں نے صرف مذہب، عشق و محبت کی داستانوں پر اکتفا کیا ہے بلکہ انھوں نے ہمہ گیر ادب پیش کیا ہے۔

دکنی ادیبوں کے یہاں عمق اور عمدہ خیالات کی کمی نہیں ہے۔ اُن کے کلام میں تخیّل کی جدّت اور بلند پردازی کے جوہر ہمدست ہوتے ہیں۔ تشبیہ اور استعاروں میں ندرت ہوتی ہے۔ ان کے جودتِ طبع اور رسائی ذہن اُن کے بلند پایہ افکار ہر حیثیت سے مستحق ستائش قرار پاتے ہیں۔

موجودہ دور کے کسی قدر بیشتر کے ادیبوں کے کارناموں اور قدیم دکنی ادیبوں کے کارناموں کو ملایا جائے تو زبان کے شُستہ اور رواں ہونے کی کمی کے سوا زیادہ فرق نہ ہوگا۔ البتہ مغربی خیالات نے ہمارے موجودہ ادب کو جو جِلا دی ہے اور سنوارا ہے اس کی کمی پائی جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ ہماری زبان چاہے زیادہ نازک اور دقیق مطالب کا مخزن کیوں نہ بن جائے۔ مگر ہم ابتدائی زمانے کی ادبی کوششوں کی احسان مندی سے کبھی سبکدوش نہ ہوسکیں گے۔

(رسالہ سب رس کانفرنس نمبر)

# قدیم اُردو (دکھنی) میں "سیرۃ النبیؐ" کا ذخیرہ

قدیم اُردو (دکھنی) میں اگر ایک طرف قصّے کہانیوں کی مثنویاں لکھی جاتی رہیں، تو دوسری طرف عقائد، فقہ، سیر وغیرہ کے متعلق بھی نظم میں معلومات پیش ہوتی رہیں۔ جیسے جیسے تحقیقات کا شوق بڑھ رہا ہے، معلومات کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ جو علمی ذخیرہ ہمدست ہو رہا ہے وہ وہم و قیاس سے بھی زیادہ ہے۔ آج ہم "سیرۃ النبیؐ" کے متعلق جو کتابیں دکھنی زبان میں ہمدست ہوئی ہیں اُن کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔

اس امر کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں کسی رفارمر، کسی پیغمبر، اور کسی مصلح کے حالاتِ زندگی اور سوانح حیات اس قدر تحقیق اور کدوکاوش سے مرتب نہیں ہوئے ہیں جس قدر کہ عربی میں "آنحضرت، رسولِ کریمؐ" کے حالات جمع کیے گئے ہیں۔ مورخین، محدثین اور مفسرین نے آپ کے حالات جمع کرنے اور اُن پر تنقیدی نظر ڈالنے، روایت اور درایت پر موشگافی کرنے، ردوقدح کرنے کا کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ غرضکہ آپ کی سیرت کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر متقدمین نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ اور اب عصرِ حاضر میں جو کام ہو رہا ہے وہ بھی اردو زبان میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم اُن دکھنی کتابوں کا تعارف کراتے ہیں، جو

"سیرتِ مقدسہ" سے متعلق ہیں۔ واضح ہو کہ قدیم زمانے میں نثر سے زیادہ نظم سے دلچسپی لی جاتی تھی۔ اس لئے علمی کتابیں بھی نظم میں زیادہ دستیاب ہوئی ہیں۔

قدیم اردو کی اکثر مثنویاں فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ فارسی مثنویوں میں معراج کا عنوان بھی ہوا کرتا تھا۔ اس لئے دکنی شعرا نے اس کا ترجمہ کرنے کے علاوہ چند مستقل مثنویاں "معراج نامہ" کے نام سے لکھی ہیں۔ ان میں بلاقی کا معراج نامہ اور مختار کا معراج نامہ خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں۔ بلاقی کا معراج نامہ ۱۰۶۵ھ میں تصنیف ہوا ہے۔ اس میں معراج کے واقعہ کو ایک افسانہ کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ جو افسانہ کی طرح صدق و کذب کا مرقع ہے۔ مختار کا معراج نامہ ۱۰۹۷ھ میں تصنیف ہوا ہے۔ اس میں معراج کے حالات کی تفصیل کرتے ہوئے آسمانوں کی سیر، جنّت دوزخ کو دیکھنے کا حال ایک افسانہ کی طرح نظم کیا گیا ہے۔

(۱) اسی شاعر مختار کی ایک اور مثنوی "مولود نامہ" کے نام سے ۱۰۹۰ھ کے قریب مرتب ہوئی ہے۔ یہ ایک مختصر مثنوی ہے۔ اس میں آنحضرت صلعم کی ولادت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۲) "مولود نامہ" کے نام سے ایک اور مثنوی ہمدست ہوئی ہے اس کا دوسرا نام "مفید الیقین" ہے۔ اس کا مصنف محی الدین فناحی ہے۔ اس نے اس مثنوی کو ۱۰۹۵ھ میں مرتب کیا ہے۔ یہ خاصی ضخیم مثنوی ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اس مثنوی میں حمد و نعت کے بعد اپنے مرشد عبدالصمد کی مدح کی گئی ہے۔ اس کے بعد نفس مضمون شروع ہوا ہے۔ آنحضرتؐ کی ولادت، تجارت کے لئے ملک شام کو جانا۔ بی بی خدیجہؓ سے بیاہ۔ وحی کا نزول۔ حضرت عمرؓ کا اسلام لانا۔ ہجرت، بدر کی جنگ وغیرہ کی صراحت کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ معجزات کا بیان بھی ہے۔

اور زیادہ تر معجزات ہی بیان کئے گئے ہیں۔ چونکہ سیرت النبیؐ کی یہ پہلی مثنوی ہے اس لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

آغاز یہ ہے۔

کروں وضو سوں درخشانی تجے
دھروں عجز سوں بھس پیشانی تجے

معلق گگن[1] کون کریا ہے سو توں
سرج[2] چاند تارے دھریا ہے سو توں

عدم کون توں پیدا کرنہار رہے
دل و جاں تج اوپرنے بلہار رہے

وحی کے ابتدائی نزول کے متعلق ملاحظہ ہو۔

در بیان اوّل وحی نزول جبرئیلؑ

سعادت ابد کس کون ہوتا اگر
سو بے وصف نت او خیر البشر

صفت[3] اد سونے مصطفےٰ کا سدا
کرے اسم پر آپ کے نت حبیبؐ فدا

کرے ناؤن[4] پر اس ہزاراں نثار
فدا ماں ہور ملک، گھر ہور دار

سوا دمشک بوشاہ عالم نواز
جتے پاک بازاں میں یوشاہ باز

یو چالیس برس کے ہوئے شاہ حبیب
حکم امر ہور نہی آیا ہے تب

سو اس وقت میں کفر تھا بہوت[5] واں
نہ یو خوش لگے مصطفےٰ کون تداں

نکل بھار[6] جاویں اد یک غار میں
اچھے جم ذھان کفر کے عار میں

ہوا پر یکایک دیکھے تد ان
معلق نظر تل پر یا تخت واں

کھڑا اس رو پر مرد یک خوب رُو
کھیا ان کون اے مصطفےٰ مشک بُو

کھیا اقرا تو بول اے جانِ جاں
فدا تجھ اوپر سوں زمیں ہور زماں

نہ کہے مصطفےٰ میں پڑھیا[7] کوچہ نین!
سو غائب ہوئے سن کہ جبرئیل ویں

---

[1] آسمان [2] سورج [3] جان [4] نام [5] بہت [6] باہر [7] پڑھا

سو حضرت اپس گھر کوں آئے ہیں تب — خدیجہ سوں احوال بولتیں ہیں سب
کہے سوں خدیجہ سو حضرت کے تئیں — کہ دو حال سوں کام خالی نئیں
کہ اکثر اوہ آئے سو ہیں جبرئیل — تیرے پر آئے خاص خدا کے خلیل
تیری عمر چالیس کی ہوئی اب تمام — سو جبرئیل اب آئے تجھ پر مدام
مبادا اگر نئیں تو شیطان لعیں! — دغا دینے آیا ہے ملعوں یقیں!
اگر پھر اوہ آیا تو توں کہہ مجھے — تا معلوم ہووے جو کچھ ہے تجھے
سو جبرئیل اتنے میں واں آئے ہیں — سو حضرت کوں گھر ہیں تداں پائے ہیں
کہ حضرت نے جبرئیل دیکھے ہیں جو — خدیجہ کوں درحال بولے ہیں تو
خدیجہ ہٹے[1] سر کا تو ستر — کہے یوں اوپڑتا ہے تمنا نظر
سو حضرت کہے نیں اودستا ہے اب — خدیجہ کہے یو فرشتا ہے تب
او آیا فرشتا سو تھا جبرئیل — کہ تمنا[1] رسالت کا یو ہے دلیل

۱؎ اتارے
۱؎ تم کو

اس تفصیل سے "مفید الیقین" کا اندازِ بیان واضح ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد کئی ایک مولود نامے، اور وفات نامے لکھے گئے ہیں۔ مگر ان کو اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

۳۔ "مولود نامہ نبیؐ"۔ اس کا مصنف شاکر ہے۔ سنہ ۱۱۰۰ھ کے قریب اس کی تصنیف ہوئی ہے۔ اس مثنوی کے چند عنوان یہ ہیں۔

بیان آغاز مولود پیغمبر۔ در بیان نور سلسلہ نبی، بیانِ نور سر عبداللہ۔ بیان دختر شاہ روم۔ بیان فاطمہ۔ بیان عبداللہ وفات یافتہ۔ بیان بی بی آمنہ در حمل آمدن وغیرہ (۱۷۰) صفحات کی یہ مثنوی ہے۔ اس میں آنحضرتؐ کی پوری سیرت کا تذکرہ ہے۔ مگر رطب و یابس صدق و کذب سب ہی شامل ہے۔ مصنف کے متعلق تفصیلی معلومات ہمدست نہیں ہوئے۔ اس مثنوی کا ایک

مخطوطہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے کتب خانہ میں محفوظ ہے زور (۹۰۱) شاکر نے اُس کو فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

کروں ابتدا میں بنام خدا
کہ او فہم ہو کر ہے وحدت سدا

سرانا صفت حمد او بیباک کوں
جنے جیو دیا اس مٹھی خاک کوں

وِلے جیو کیا سو کسے نیں ہے خام
ہو حیران ڈھونڈتے ہیں سب خاص و عام

---

اُجالے ہوئے پر سُنے یو خبر
مسلمان ہونے کوں آئے عمرؓ

جو ئے بھیاں کوں سات عمر بیگ آئے
محمدؐ کوں دیکھے سو ایمان لیائے

عقیدے نبی پاک ظاہرا تھے
سو حق کنے بہوت ظاہرا تھے

مشرف ہوئے جوں وہ دیدار سوں
نبی لائے جہانیکو لئے پیار سوں

عمرؓ کہے اے سرورِ انبیا
میں دھرتا ہوں خبر بہوت جاجیا

کہ صورت و سیرت نبی پاک ہے
سو ہے اہلِ عصمت شرف ناک ہے

لیوا امید میری سو دل میں اچھے
جو صاحب کے خدمت میں دیوں کہے

۱۸۔ معراج نامہ شاہ قربی

ارکاٹ کے مشہور شاعر شاہ ابو الحسن قربی کی تصنیف ہے جو ۱۱۴۸ھ کے بعد مرتب ہوئی ہے۔ اس میں معراج کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ آسمانوں کی سیر۔ جنّت۔ دوزخ کا بیان وغیرہ امور کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ چند شعر یہ ہیں۔

سرانا خدا کوں سزاوار ہے
کہ ہر ذرّہ اُس کا نمودار ہے

ہر اک ذرّہ رکھتا ہے اُس کا اثر
اچھے دال اُس کی صفت ذات پر

او کُن بول سو جیا ہمہ جن وانس
بھی سارے خلائق کتنے جنس جنس

---

سو بیت المقدس کوں پہونچا شتاب     ملک آئے آگے مرے بے حساب
مرے پر سلام تحیّت کیئے     خدا کے کرم کی بشارت دیئے
اوتاریا وہاں بھی مجھے جبرئیل     بندیا بیگ اوتازے بی بدل
نبیاں کی جماعت آگے چل کر آئے     مجھے بہوت حرمت سو اگے لیجائے
کہا جبرئیل اے محمدؐ نبی     دو رکعت گزارو یہاں پہ بھی
نبیاں کے تمین بیگ ہوکر امام     کرو اس دو رکعت کیتی تم تمام
کیئے حمدِ حق کا پڑے بعد ازاں     موافق آپس کے او پیغمبراں
کیا ذوالمنن کا ہیں حمد و ثنا ر     کہ کوئی نیں کیئے یوں ثنا کا بیاں
بزاں ہات میرا پکڑ جبرئیل!     ہوا مجھ کوں ستھری طرف اودیل

۵۔ روضۃ الانوار۔ یہ مثنوی ولی ویلوری کی تصنیف ہے اور ۱۱۵۹ھ میں مرتب ہوئی ہے۔ ولی ویلوری کا نام میر ولی فیاض تھا۔ ویلور علاقہ مدراس کا رہنے والا تھا۔ اولاً فوجی خدمت کے سلسلہ میں قلعہ دار سات گڈھ کی ملازمت میں شامل رہا۔ اس کے بعد سدھوت آکر قلعہ دار سدھوت کی ملازمت اختیار کی۔ نواب عبدالحمید خاں کے درباری شاعر کی حیثیت سے علمی کام میں مصروف رہا۔ پھر چیٹ پٹہ (علاقہ مدراس) جو اُس کی جاگیر تھی اقامت کرلی اور یہاں ہی انتقال ہوا۔ افسوس ہے انتقال کا سنہ معلوم نہ ہو سکا۔

ولی ویلوری کی کئی ایک تصانیف ہم کو معلوم ہیں یعنی روضۃ الشہدار۔ روضۃ الانوار۔ روضۃ العقبیٰ۔ دعائے فاطمہ وغیرہ۔ روضۃ الشہدار مشہور کتاب ہے۔ حسین کاشانی کی روضۃ الشہدار کا ترجمہ ہے اور ۱۱۳۰ھ میں مرتب ہوا ہے۔ اس کے مخطوطات مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

دعائے فاطمہ کا ایک نسخہ انڈیا آفس میں ہے۔ روضۃ الانوار اور روضۃ العقبیٰ

نایاب مثنویاں ہیں۔ ان کا تعارف پروفیسر غلام مصطفےٰ خاں صدر شعبۂ اردو سندھ یونی ورسٹی نے رسالہ معارف میں کرایا تھا اور پھر اس مضمون کو اپنی کتاب "علمی نقوش" میں شامل کر دیا ہے۔

اس مثنوی کے (۲۲۴۰) شعر ہیں۔ عنوانات کی فہرست طویل ہے جن میں سے بعض عنوان یہ ہیں۔

ذکر نور نبی۔ واقعات در مدت حمل۔ ذکرِ ولادت۔ شیر خوردن۔ سفرِ شام۔ خواستگاری خدیجہؓ۔ ابتداء وحی۔ اسلام حمزہؓ۔ اسلام عمرؓ۔ ہجرت۔ وفات بی بی خدیجہؓ۔ معراج۔ ذکر معجزات۔ جنگ بدر۔ جنگ احد۔ جنگ احزاب، جنگ بنی قریظہ۔ جنگ تبوک۔ افک عائشہؓ۔ فتح خیبر۔ فتح مکہ۔ جنگ حنین۔ فتح طائف۔ حج الوداع وغیرہم۔

اس صراحت سے مثنوی کے اندراجات کا علم ہو سکتا ہے۔ معجزات کے بیان میں چالیس معجزے بیان کئے گئے ہیں۔ باقر آگاہ کی صراحت سے واضح ہوتا ہے کہ ولی نے غیر معتبر روایات کو بھی اپنی تصنیف میں جگہ دی تھی۔ چونکہ اُس زمانے میں قصے کہانیوں کا زیادہ رواج تھا۔ اس لئے اس قسم کے واقعات سے دلچسپی لی جاتی تھی۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے ؎

کئے یو نقل حضرت عمرؓ خطاب ۔۔۔ ہوا معراج کا جس دن خوشی باب
کیا حضرت رسول اللہ سوں ہیں سوال ۔۔۔ نہانی رازہا کا کچھ کرو قال
سو فرمائے کہ اُمت کا شکایت ۔۔۔ کیا منجاب یوں و و ربِّ عزّت
کہ عصیاں در رہیں سب مل بہ خلوت ۔۔۔ کریں دو انجمن میانی اطاعت
و لے میں پردہ پوشی میں ہوں ستّار ۔۔۔ ہوں دائم بخششِ رحمت سوں غفار
علی مرتضیٰؓ سوں ہے یو منقول ۔۔۔ سخن رازِ نہانی کا یو مدلول

گنہ کرتے تھے اُمتہائے پیشیں | عذاباں تزت ان پر پڑتے سو لعیں
کہ بعضے غرق ہو در آبِ طوفاں | ہو کیتے آب رودِ نیل غرقاں
کیتاں کوں صیحۂ جبرئیل سوں مار | ہوا بعضاں اُپر بارانِ سنگسار
کیتے غرقِ زمیں ہیں مثل قاروں | چلے جاتے اچھوں تحت الثریٰ کوں
کیتاں کے تیں سو مسخ صورتاں کر | ہوئے تلپٹ کتے از بادِ صرصر
کیتاں کوں بھیں سمیت اُلٹا کو مارے | جہنم کے لئے دو باٹ سارے
ولیکن تجھ اُمّت کوں یا محمدؐ | بدی ان کی کوں کرنے کی ستی رد
تری اُمّت ہیں منجہ کوں بہوت پیاری | غضب ہور قہر سوں یو ہیں کنارے[1]

۶- اعجازِ احمدؐ ۔ یہ مثنوی حیدرآباد کے شاعر شہیدا کی تصنیف ہے ۔ شہیدا کا نام نوازش علی تھا ۔ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کا میر ساماں تھا۔ "خان بہادر" کا خطاب ملا تھا ۔ جاگیر مرحمت ہوئی تھی ۔ حیدرآباد کا بادشاہی عاشور خانہ جو قطب شاہی دور میں تعمیر ہوا تھا، آصفی دور میں اس کی نگرانی میں تھا۔ منتظم عاشور خانہ کی حیثیت سے اُس نے عزاداری اور مرثیہ خوانی کو بہت فروغ دیا ۔ خود بھی مرثیے تصنیف کرتا تھا ۔ اس کی بھی کئی کتابوں کا پتہ چلتا ہے ۔ جن میں سے بعض یہ ہیں ۔

روضتہ الاطہار ۔ اس کی تصنیف ۱۱۷۳ھ میں ہوئی ۔ یہ ضخیم مثنوی ہے اس کو صرف تین ماہ بیس دن میں تمام کیا تھا ۔ اس میں شہادت امام حسینؑ کے واقعات اور امام کے حالات لکھے گئے ہیں ۔

---

[1] علمی نقوش مؤلف ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صدر شعبۂ اُردو سندھ یونی ورسٹی

**گلشنِ ایمان** - یہ بھی مثنوی ہے۔ اس میں نعتیہ کلام اور معجزات جمع کیے گئے تھے۔ مگر یہ کتاب نایاب ہے۔ اب تک کسی کتب خانہ میں دستیاب نہیں ہوئی۔

**اعجازِ احمد** - یہ مثنوی روضۃ الاطہار سے زیادہ ضخیم ہے، اور اس کی تصنیف ۱۱۸۷ھ میں ہوئی ہے۔ اس کی چار جلدیں ہیں۔ پہلی جلد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے چالیس سال کی عمر تک کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ نورِ محمدی، حمل، ولادت، رضاعت، شقِ صدر، رحلتِ آمنہ، وفات عبدالمطلب، آنحضرتؐ کا تجارت کے لیے ملک شام کو جانا، خدیجہ کا نکاح، حجرِ اسود کا نصب کرنا وغیرہ عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔

دوسری جلد بعثت سے ہجرت تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں نبوت کی ابتدا، بی بی خدیجہؓ اور حضرت علیؓ کا اسلام لانا۔ ابوبکر صدیقؓ، عثمانؓ وغیرہ کا اسلام لانا، آنحضرتؐ کا قریش کو دعوتِ اسلام دینا۔ قریش کا ظلم و ستم، ہجرتِ حبشہ، حضرت حمزہؓ کا اسلام لانا۔ حضرت عمرؓ کا ایمان لانا۔ سفرِ طائف، وغیرہ کا بیان ہے۔ بعثت کے سنین کے لحاظ سے ان کا تذکرہ ہوا ہے۔

تیسری جلد میں ہجرت سے وفات تک حالات درج ہیں۔ اس میں ہجرت کے سنین کے لحاظ سے واقعات کا اندراج ہوا ہے۔ عبداللہ بن سلام کا اسلام لانا، سلمان فارسی کا ایمان سے مشرف ہونا۔ بی بی فاطمہ زہرہؓ کا عقد، جنگ بدر، جنگِ احد، جنگ تبوک، حج الوداع، وفات وغیرہ عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔

جلد چہارم میں حالات بعد وفات، معجزات اور فضائل - زیارت تربت وغیرہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پہلی اور دوسری جلد کا حجم ۱۰۵ صفحے اور تیسری جلد ۲۶۱ صفحے پر مشتمل ہے۔

عنوانات فارسی نثر میں لکھے گئے ہیں۔ پوری مثنوی کے اشعار کی تعداد تقریباً بیس ہزار ہوتی ہے۔ اس تفصیل کے بعد اب ہم اس مثنوی کا نمونۂ کلام پیش کرتے ہیں۔ ابوطالب کا آنحضرتؐ کو اپنے ساتھ سفر میں لے جانا ہ

رسولِ خداؐ کے سنوں کا ن دھر — ہوئی جب تیرا برس کی عمر
ابوطالب اس وقت کیتے خیال — کہ جا شام کچھ مول لا بیچے مال
اٹھی اون دنوں دھوپ سخت سنے — کہے دل میں اپنے محبت سنے
محمدؐ کوں یہاں چھوڑ جانا بھلا — کہ گرمی سیں تا ہوئے وہ مبتلا
ولیکن جدائی کی طاقت نیں — پڑے اون پہ کوئی اس سیں آفت نین
لگے سین لگا کر کہنے کس سبب — تو گریاں ہے میرے سین اب
پیمبرؐ نے کچھ نا کہے ہیں یہاں — پچھانے ابوطالب اون کا گماں
کہے دل میں تیرے یہ آئی ہے بات — سفر کوں نہ لیجاؤں گا اپنے سات
نبیؐ نے کہے فکر تھی مجھ کو بھی — کہ جاوے گا کیوں کر جدائی سہی
ابوطالب اس وقت کھائے قسم — جدا تجھ کوں کرنا نیں ایک دم
سمجھتا ہوں مجھ تن کا ہے جان توں — نیں چھوڑ جاتا ہوں تن جان کوں
وہاں میں سفر کا وہ ساماں کیے — محمدؐ کوں ہمراہ اپنے لیے
تھا بصرا سیں ایدھر کوئی چھ کوس گاؤں — تھا وہ قافلے کے اُترنے کا ٹھاؤں
تھا اُس جا یئے پر ایک زاہد بڑا — نصارا کا تھا عالم اور مقتدا
بحیرا انھا عالم میں مشہور نام — تھا توریت و انجیل از بر تمام
کتابوں سنے وہ پچھانتا اتھا — کہ آوے گا اس جا خیر الورا

## جنگِ بدر کا حال

کھڑے آ کے میداں میں صف باندھ کر ۔ لگے بجنے کرنائے حرب ہر تدبر
یہ ہل چل کنیں کافروں کے سجھا ۔ صحابیوں کو بولے رسولِ خدا
پئے نامِ خدا ہوؤ تم اب سوار ۔ کہ ہے فتحِ اعدا پہ وہ دیتے ہار
کہے پر رسولِ خدا کے وہیں ۔ ہوئے مستعد سارے اصحابِ دیں
کھڑے آ کے کفار کے روبرو ۔ پیاسی تھی سپاری بنجوی عدو
حبیبِ خدا نے عصا اپنے ہات ۔ صف آرائی کرتے تھے ترتیب سات
مناسب تھا جس شخص کا جو مکاں ۔ دیتے بیچ اس کو وہ شاہنشیاں
سوا ایک صحابی تھا آگے وہ بڑ ۔ کھڑا ہات شمشیر اپنی پکڑ
عصا اس کے سینے پہ حضرت نے مار ۔ کہے کیوں بڑا صف سے اے دیندار
یہ سنتے پھرا اور کہا التماس ۔ مجھے اس ضرب سے دکھ ہوا بے قیاس
قصاص اس کا مجھ دیو یا مصطفےٰ ۔ دیئے کھول سینہ رسولِ خدا
لیا دوڑ سینہ کا بوسہ سوار ۔ لگا عرض کرنے کو ہو شاد شاد
مجھے آرزو تھی دمِ آخریں ۔ کہ یہ دولتیں پاؤں بادشاہِ دیں

---

## آنحضرتؐ کی وفات کا تذکرہ

صحابہ کھڑے تھے بہر کر ہجوم ۔ سنئے گھر کے اندر یہ ماتم کا دھوم
سبھی مل کے رونے لگے زار زار ۔ لگے بولنے اس طرح سے پکار
کہ اے اہلِ بیتِ رسالت مآب ۔ ہوا وجھل کرو ہم کو تم باریاب
ہمارے نبی کا دیکھنا ہم محال ۔ ہے یہ وقت آخری کریں کچھ مقال

رسولِ خدا سُن یہ فرمائے تب ہوا اوجھل بولاؤ صحابیوں کو سب
صحابی پہ حضرت کا احوال ایک لگے کرانے ماتم سے ایک ایک
نبی اُن کی دلداری کرنے لگے وہ غمگیں تھے غمخواری کرنے لگے
کرے ایک ایک کر سبھوں سے کلام کیئے رخصت ان کو عہد اسلام[1]

اس کتاب کے مخطوطات حیدرآباد کے بعض کتب خانوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ کتب خانہ آصفیہ میں اس کا مکمل نسخہ موجود ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ میں اس کے کئی نسخے ہیں۔ اس کی طباعت نہیں ہوئی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے میں اس کے چند حصّے موجود ہیں۔

**ہشت بہشت** یہ مثنوی مولانا باقر آگاہ کی تصنیف ہے۔ محمد باقر نام اور آگاہ تخلص تھا۔ ان کے اجداد بیجاپور کے رہنے والے تھے۔ بیجاپور کی تباہی کے بعد آگاہ کے والد مولانا محمد مرتضٰی ویلور (علاقہ مدراس) آگئے۔ اسی کو وطن بنالیا۔

آگاہ کی پیدائش اسی مقام پر ۱۱۵۷ھ میں ہوئی۔ علماء وقت سے آگاہ نے تعلیم حاصل کی اور شاہ ابوالحسن قربی کے مرید ہو کر روحانی تعلیمات کے فیض سے بھی متمتع ہوئے، عربی، فارسی اور اُردو میں شعر گوئی کا ملکہ حاصل تھا، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی پر صرف ونحو کے چار سو اعتراض کیئے تھے۔ مگر اس کے باوجود ان دونوں میں خلوص اور اتحاد تھا۔ آگاہ نے اپنے کلام میں اس دوستی کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ پندرہ سال کی عمر سے آگاہ نے شاعری شروع کی اور اپنے انتقال ۱۲۲۰ھ تک اُردو زبان کی خدمت میں مصروف ومنہمک رہے۔ آگاہ کی تصانیف

---

[1] اعجاز احمد

کی تعداد ۳۰۰ بیان کی جاتی ہے، ان میں ۶ کتابیں اردو (دکھنی) میں ہیں۔

آگاہ کے زمانہ میں ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیل گئی تھی۔ کلائیو اور وارن ہیسٹنگز کا دور دورہ تھا۔ مغل خاندان پر زوال آچکا تھا اور اس کا چراغ گُل ہو رہا تھا۔ اہلِ علم دنیا سے گزر رہے تھے اور اُن کی جگہ پُر کرنے والا نظر نہ آتا تھا۔ سلطنت کی زبان فارسی نہ رہی تھی۔ اگرچہ عام طور سے اُردو کا رواج ہو رہا تھا، مگر اقلیم اُردو میں علم و فن کا ذخیرہ نایاب تھا۔ اہلِ فرنگ ہنوز اُردو کی جانب متوجہ نہیں ہوئے تھے، نہ تو کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات شائع ہوئی تھیں اور نہ شاہ عبد القادرؒ نے قرآن مجید کی تفسیر قلمبند فرمائی تھی۔ عام طور سے تعلیم کی کمی تھی، خصوصاً عورتوں کی تعلیم کا دروازہ بالکل بند تھا اور یہ ناممکن تھا کہ فارسی میں جو اب مادری زبان نہ رہی تھی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس نقص کے باعث سوسائٹی کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا اور حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔

اس نقص کو معلوم کرنے والا، اس مرض کو دریافت کرنے والا، اس کے علاج پر کمرِ ہمت باندھنے والا، اور اپنی تصنیفات سے اس کا علاج کرنے والا آگاہ اور صرف آگاہ ہے۔ آگاہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کو بھی ضروری تصور کیا اور اُن کے لئے خاص کتابیں لکھیں۔

آگاہ کا سب سے پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اُردو زبان میں سیر، فقہ، عقائد پر متعدد کتابیں تصنیف کیں اور پھر خاص طور سے اُن کو عورتوں کی تعلیم کے لئے مرتب کیا۔ آگاہ کے زمانہ میں مبالغہ اور دروغ گوئی کلام کا خاص امتیاز تھا اور جو کتابیں "واقعۂ کربلا" اور "سیرت" کی لکھی گئی تھیں وہ بھی صداقت سے دُور تھیں۔ اس کے برخلاف آگاہ نے دروغ گوئی اور مبالغہ سے پرہیز کیا اور پھر عام طور سے

اُس وقت کی عام فہم اور سلیس زبان میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کیا۔ آگاہ کے قصائد، غزلیات اور مثنویاں اہم حیثیت رکھتی ہیں تفصیلی واقعات کے لیے راقم کی کتاب "مدراس میں اُردو" صفحہ ۳۳ تا ۵۷ ملاحظہ ہو۔

"ہشت بہشت" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ دراصل آٹھ رسالوں یا آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اور ہر رسالہ ایک علیحدہ نام سے لکھا گیا اور "سیرتِ مقدس" کے مختلف مباحث پر مشتمل ہے۔ ان کی تصنیف ۱۱۸۶ھ سے ۱۲۰۶ھ تک ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

(۱) من دیپک۔ اس میں نور محمدیؐ کا تذکرہ ہے۔

(۲) من ہرن۔ اس میں نبوّت کی بشارتوں کا بیان ہے۔

(۳) من موہن۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۴) جگ موہن۔ اس میں آٹھ سال کی عمر سے وفات تک حالات درج کیے ہیں۔

(۵) آرام دل۔ اس میں اخلاق وشمائل نبوی کا تذکرہ ہے۔

(۶) راحتِ جان۔ آنحضرتؐ کے خصائص کا حال درج ہے۔

(۷) من درپن۔ اس میں معجزات نبوی کا بیان ہے۔

(۸) من جیون۔ اس میں آنحضرتؐ کے آداب اور آپ سے محبت رکھنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

آگاہ نے ایک دیباچہ بھی نثر میں لکھا ہے، اس کا مختصر اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔ اس دیباچے سے کئی باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔

"بعض علماء متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تا وہ لوگ جو عربی پڑھ نہیں سکتے ہیں ان سے فائدہ پاویں لیکن اکثر عورتاں اور تمام امیان فارسی سے بھی آشنا نہیں ہیں۔ اس لئے

یہ عاصی مطلب قسم اوّل کا بہت اختصار کے ساتھ لے کر دکھنی رسالوں
میں بولا ہے، اور ہر رسالے کے وزن علیحدہ ہونے سے خواہش و
آرزو پڑھنے والوں کی زیادہ ہووے۔ چھ رسالے اوّل کے مع رسالہ
عقائد سنہ ایک ہزار ایک سو اور اسّی پر پانچ میں اور ایک ہزار ایکسو
اور اسّی اور چھ میں بنے ہیں۔ اور آخر ابتدائے سنہ ایک ہزار اور
دو سو اور چھ میں رسالہ "من درپن" اور رسالہ "من جیون" بنانے
کا اتفاق ہوا۔ ان آٹھوں رسالوں میں تخمیناً آٹھ ہزار اور چھ سو اُپر
پچاس بیت ہیں، اور سرخیوں کے ساتھ نو ہزار بیت ہوں گے اور
ان سب رسالوں میں شاعری نہیں کیا ہوں بلکہ صاف اور سادہ کہا
ہوں، اور اُردو کے بھاکے میں نہیں کہا کیا واسطے کہ رہنے والے
یہاں کے اس بھاکے سے واقف نہیں ہیں۔

ارے بھائی یہ رسالے دکھنی زبان میں ہیں کر کر سہل اور سرسری
نہ جان کیا واسطے کہ بڑے معتبر کتب سے تحقیق کر کر لکھا ہوں۔ اگر وہ
تمام کتاباں تو دیکھے گا یا کسی سے سنے تو تجھے قدر ان رسالوں کی معلوم
ہوگی۔"

جو اُمور اس سے واضح ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔

الف۔ ان رسالوں کی تصنیف ۱۱۸۵ھ سے ۱۲۰۶ھ تک ہوئی۔

ب۔ ان رسالوں کے اوزان علیحدہ علیحدہ ہیں۔

ج۔ کل اشعار کی تعداد نو ہزار ہے

د۔ ان کو شمال کی اردو میں نہیں لکھا گیا بلکہ دکھنی میں لکھا گیا۔

و۔ عربی کی معتبر کتابوں سے معلومات اخذ کر کے ان کی تصنیف ہوئی ہے۔

ایک دوسری مثنوی کے دیباچے میں بھی آگاہ نے اپنی مثنویوں کو معتبر کتابوں سے اخذ کرنے کا تذکرہ ان اشعار میں کیا ہے ۔

"اے بھائی اکثر بلکہ سب دکھنی کتاباں بنانے والے بیان میں ایسی بہت غلط کئے ہیں کہ اس زبان کو بے اعتبار کردے ۔ اس لئے علماء ان کتابوں کی طرف التفات نہیں کرتے ۔ آج تک کوئی کوئی کتاب دکھنی صحیح و معتبر میری نظر میں آئی نہیں ۔ بعض ان سے سرتا پا جھوٹ سے بھری ہیں ۔ اور بعضوں میں جھوٹ زیادہ اور بعضوں میں جھوٹ کم ہے ۔ روایات موضوع کا سننا اور سنانا اور پڑھنا اور پڑھانا اشد حرام ہے شکر خدائے تعالیٰ کا کہ میرے تمام رسائل صحیح و معتبر و نہایت مضبوط و مدلل ہیں ۔ کوئی محدث اور صاحب علم کو مقدور نہیں کہ اس کی کوئی روایت پر حرف رکھ سکے ۔ ولی ویلوری و شیدائے حیدرآباد نے دکھنی زبان میں دو نسخے منظوم لکھے ہیں ۔ ان کا نام "روضۃ الشہدا" اور "روضۃ الاطہار" ہے ۔ مناقب عترت اخیار کے ان دونوں میں بہت کم ہیں بلکہ نہیں ہیں ۔ واقعات شہادت کے کچھ تفصیل کئے ہیں ، اور اکثر بیان دونوں کا غلط اور بے اصل ہے ۔ جیسا کہ انتقام چھنا عکاشہ کا آنحضرت سے ۔ اکثر اہل سیر اس فن کے تساہل و سہل انکاری کے تئیں شیوہ اپنا کیا ۔ تواریخ کی لکھنے میں ضبط و تدقیق نہیں کئے بلکہ رطب و یابس جو پائے سو لکھ گئے ۔ اس جہت سے ان کی کتابوں میں غلط باتیں اور بے اصل روایتیں بہت پائی جاتی ہیں ۔ جیسا "حبیب السیر" "روضۃ الصفا" اور "روضۃ الشہدا" ۔"

اس صراحت سے واضح ہوتا ہے کہ آگاہ کو صحت کا کس قدر خیال تھا اور

انھوں نے کس طرح دوسری کتابوں کے نقص کو ظاہر کر دیا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آگاہ نے غلط روایات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن آگاہ کے زمانے کا ماحول آج کل کے ماحول سے مختلف ہے۔ اس لئے ممکن ہے جن امور کو آگاہ نے معتبر تصور کر کے لکھا ہے وہ آج درایت کی روشنی میں قبول نہ ہوں۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آگاہ نے معتبر احادیث کو اپنا ماخذ نہیں بنایا تھا۔ اس تفصیل کے بعد اب ہم نمونۂ کلام پیش کرتے ہیں۔

## بی بی آمنہ کا آنحضرتؐ کو اپنے ساتھ مدینہ لیجانا

جب ہوا چار سال کا سرور — دس برس کے تھا طفل سے ہمسر
لے گئی حضرت آمنہ خاتوں — سات اپنے اُسے مدینے کوں
ماموان سے ملائی اس کو لے جا — سب ہوئے باغ باغ اس کو جھا
وہ مدینے منے رہے ایک ماہ — اُم ایمن بھی تب تھی ہمراہ
جب او ہجرت کیا مدینے میں — بولتا تھا اپس کنے یاراں سیں
اُتری تھی ماں مری یہ گھر کے بھیتر — سارے احوال مجھ کو ہیں ازبر
تیرنا بھی سیکھا ہیں وہاں شتاب — آ مجھے دیکھنے تھے اہلِ کتاب

---

ہجرت کے دوسرے سال کا بیان حسب ذیل ہوا ہے ؎

سال دوم منے بے قیل و مقیل — ہو گیا قبلہ بلا شک تحویل
تھا اوّل بیت مقدّس قبلہ — پس ہوا کعبۂ اقدس قبلہ
اور اسی سال سنو اے یاراں — ہو گئے فرض صیام رمضاں
اور اسی سال زہرا کو شاہ — کر دیا حیدرِ کرار سے بیاہ

اور اسی سال منے بے تکرار | صدقۂ فطر ہوا فرض اے یار
صدقۂ فطر کے بعد از سن بات | ہو گیا اُمت پر فرض زکوٰۃ
اور اسی سال ہوا غزوۂ بدر | ہے بڑی جس کی بہت عزت و قدر
آلڑے اس میں ملک باکفار | بدریاں سب ہیں بہشتی اے یار
اور اسی جنگ کے بعد از اے جان | لایا عبّاس نبی پر ایمان
تھے قریشیوں میں جو کفّار کبیر | ہوئے اس جنگ میں مقتول و اسیر
اس غزا بیچ ابو جہل لعین | قعرِ دوزخ میں ہوا گوشہ نشین
جب پھرا بدر ستے وہ سالار | گئی تھی جنّت کو رُقیہ اے یار
بے گماں اوّل وبعثت میں شاہ | کر دیا تھا اسے عثمان سے بیاہ
اور ابو رافع و ابن الاشرف | گئے ہو مقتول جہنم کے طرف
ابن شیبہ دلپسر سفیان کا | ماسے جا کر لئے آتش میں جا

---

سراپائے رسولؐ میں ابروئے مبارک کے متعلق اس طرح وضاحت کی ہے ؎

بھواں شہ کے باریک تھے اور دراز | بھی تھے تھوڑے پیوستہ اے سرفراز
کماندار تھے اور بہت تھے سیاہ | احادیث اس بات پر ہیں گواہ

الٰہی ہمیشہ بشام و سحر
اس ابرو کو مجھ دل کا محراب کر

جیسا کہ قبل ازیں تذکرہ کیا گیا ہے، جنگ و جدل وغیرہ کے حالات کے برخلاف آگاہ نے آنحضرتؐ کے اخلاق اور عادات کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے۔ آپ کی تواضع کے متعلق آگاہ کی تفصیل ملاحظہ ہو ؎

تواضع میں اس کا کروں کیا بیاں | کہ ہے اس سو عاجز قلم ہور زباں

اوّل آپ کرتا تھا سب کو سلام — اچھے طفل یا زن اچھے یا غلام
اپے اپنے کپڑیاں کو دھوتا تھا شاہ — بھی سیتا اسے آپ وہ دیں پناہ
اپے اونٹ کا چارہ بھاتا اتھا — خادم کے سنگ ٹکو کھاتا اتھا
بھی گنتا تھا آٹا آپس ہاتھ سیں — متاع اپنی لاتا آپس ہاتھ میں
غرض اپنے خدمتاں او تمام — تھا کرتا آپس ہاتھ سو وا سلام
صحابیاں ہیں مل بیٹھتا سب کے ساتھ — ملی جان اسے جا گہ اے نیک ذات
صحابہ بحکم شہ بحر و بر — کیے ذبح بکرے کو دریک سفر
دیا سب کو بانٹ اس کے کاماں تمام — لیا اپنے ذمے میں لکڑیاں کا کام
خبر ہے کہ وہ سرورِ دلفروز — لگیا وعظ کرنے کتیں ایک روز
اتھے اس کی خدمت میں سب خاص و عام — بھرا ان کے کثرت ستے گھر تمام
سو اس وقت کے بیچ آیا جریر — جگا بیٹھنے کی نہ پایا جریر
ہو لاچار آخر وہ فرخندہ یار — زمیں پر گیا بیٹھ مجلس کے بھار
وہ سالار واقف ہوا اس حال پر — شتابی سے گولا کر اپنے چدر
دیا پھینک اس کے طرف ہور کہا — کہ بیٹھ اس کے اوپر تو اے باوفا
دے بوسہ اسے اور رکھ آنکھ پر — بیٹھا اوڑ اسے سر پو وہ خوش سر
کہا خادم خاص شہ کا انس — کہ میں اس کی خدمت کیا دس برس
تھا چہیتا مجھے بہوت وہ نامور — کیا نیں کبھی غصہ میرے اوپر
میں جس کام کو اس کے کرتا اتھا — نہ حرف اپر اس کے دھرتا اتھا
بھی جو کام کرتا نہ تھا اس کا میں — نہ کہتا کہ کیوں نیں کیا اس کتیں

تصدق سو اس خو کے اے دادگر
مجھے کر تواضع منے مشتہر

اس نمونے سے آگاہ کے کلام کا اندازہ بخوبی واضح ہوتا ہے۔ "ہشت بہشت" عرصہ دراز تک خاص وعام میں مقبول تھی۔ میلاد کی مجالس میں اس کو پڑھا جاتا تھا۔ بمبئی اور مدراس میں کئی مرتبہ طبع ہوئی ہے۔ اس کے مطبوعہ نسخوں کے علاوہ قلمی نسخے بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ دکن کے کتب خانوں کے علاوہ یورپ کے کتب خانوں میں بھی اس کے مخطوطات موجود ہیں۔ چنانچہ پیرس کے کتب خانہ میں خود مصنف کا صحت کردہ نسخہ موجود ہے[۱]۔

۸۔ **معجزاتِ رسالت**۔ یہ ایک مثنوی ہے جس کو مخدوم حسینی نے تصنیف کیا ہے۔ تصنیف کی سنہ کا پتہ نہیں چلا۔ جیسا کہ نام سے واضح ہے۔ اس میں چند معجزات کا تذکرہ ہے۔ زیادہ تر صرف ایسے معجزے ہیں جو اہلِ بیت رسالت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے کسی کتب خانہ میں مجھے اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔ انڈیا آفس میں اس مثنوی کا ایک نسخہ ہے جس کا تذکرہ میں نے اپنی کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں کردیا ہے۔ صفحہ ۵۱۲

۹۔ **وفات نامہ پیغمبرؐ**۔ یہ بھی ایک دکھنی مثنوی ہے جس کو کسی شاعر "میرؔ" نے جو غیر معروف ہے تصنیف کیا ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس میں آنحضرتؐ کی وفات کا تذکرہ ہے۔ مگر بہت کچھ صدق وکذب کی آمیزش ہے۔ اس کا بھی ایک نسخہ یورپ میں انڈیا آفس کے کتب خانہ میں دیکھا گیا تھا۔

۱۰۔ **شمائلِ محمدیؐ**۔ ایک دکھنی مثنوی عثمان کی تصنیف ہے۔ شمائل کی اہمیت اور اس کے بعد شمائل کا تذکرہ ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں اس کا ایک مخطوطہ محفوظ ہے۔ (سروری ۳۰)

---

[۱] دیکھو راقم کی کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" صفحہ ۳۶ ؁

۱۱۔ شمائل النبی ۔ یہ مثنوی عبد المجید کی تصنیف ہے اور "پشتو" زبان سے دکھنی میں ترجمہ کی گئی ہے۔ اس میں آنحضرت کا سراپا، اخلاق اور عادات کا تذکرہ نہایت خوبی سے کیا گیا ہے ۔ ادارۂ "ادبیات اردو" کے کتب خانہ میں اس مثنوی کا ایک نسخہ موجود ہے ۔ اس کے علاوہ سالار جنگ کے کتب خانہ میں کئی نسخے موجود ہیں ۔

۱۲۔ وفات نامہ سرور کائنات ۔ یہ مثنوی ۱۱۱۱ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ کوئی غیر معروف شاعر دریا تخلص کی تصنیف ہے ۔ ادارۂ "ادبیات اردو" کے کتب خانہ میں اس کا مخطوطہ موجود ہے ۔

۱۳۔ وفات نامہ اصحی ۔ یہ مثنوی سالار جنگ کے کتب خانہ میں ہے تصنیف کا صحیح سنہ معلوم نہیں ہوا ۔ مختصر مثنوی ہے ۔

(۱۴) تولد نامہ ۔ کسی نامعلوم شاعر کی مثنوی ہے ۔ کتب خانہ سالار جنگ میں ایک نسخہ موجود ہے ۔

(۱۵) مولود النبیؐ کسی شاعر قاسم کی مثنوی ہے ۔ ضخیم مثنوی ہے ۔ اس کو ربیع الاول کے بارہ دن پڑھنے کے لیئے بارہ مجالس میں لکھا گیا ہے ۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے ۔

(۱) ولادت (۲) آنحضرتؐ کا بچپن اور جوانی ، بی بی خدیجہؓ سے نکاح پر یہ مجلس ختم ہوتی ہے (۳) بعثت اور نبوت ، بعثت کے چھٹے سال تک کا احوال ہے ۔ (۴) معراج (۵) چھٹے سال تک ہجرت تک کا بیان (۶) ہجرت کا بیان (۷) مدینہ کا حال جنگ بدر ، جنگ احد اور جنگ خندق کا تذکرہ ہے (۸) جنگ خندق کے بعد خیبر کی جنگ وغیرہ کا حال درج ہے (۹) اس نسخہ میں یہ فصل متروک ہوگئی ہے (۱۱) فتح مکہ کا تذکرہ (۱۲) آنحضرتؐ کی وفات کا حال درج ہے ۔ قاسم کے

کلام کا نمونہ درج ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے متعلق کوئی معلومات ہمدست نہیں ہوئے اس مثنوی کا ایک نسخہ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

سعادت ابد کس کون ہونا اگر — سو ہے وصف نت او خیر البشر
صفت اد سو ہے مصطفےٰ کا سدا — کرے اسم پر آپ کے نت جیو فدا
کرے ناموں پر اس ہزاراں نثار — فدا مال ہور ملک گھر ہور دار
سوا دمشک بوشاہ عالم نواز — جنے پاک یاراں ہیں یوشاہ باز
یو چالیس برس کے ہوئے شاہ جب — حکم امر ہور نہی آیا ہے تب
سو اس وقت میں کفر تھا بہوواں — نہ یو خوش لگے مصطفےٰ کو تداں
نکل بھار جاویں ادیک غار میں — اچھے جم دھان کفر کے عار میں
ہوا پر یکایک دیکھے تداں — معلق نظر تل پڑ یا تخت واں
کھڑا اس اوپر مردیک خوب رو — کھیا ان کون اے مصطفےٰ مشک بو
کھیا اقرار تو بول اے جان جاں — فدا تجہ اوپر سوں زمیں ہور زماں
کھے مصطفےٰ میں پڑیا کو چہ نیں — سو غائب ہوئے سنکہ جبرئیل ویں
سو حضرت اپس گھر کون آئے ہیں تب — خدیجہ سوں احوال بولیں ہیں سب
کھے یوں خدیجہ سو حضرت کے تیں — کہ در حال سوں کام خالی سو نیں
کہ اکثر رو آئے سو ہیں جبرئیل — نبی ہے پر آئے خاص خدا کے خلیل
تری عمر چالیس کی ہوئی اب تمام — سو جبرئیل اب آئے تجہ پر مدام

۱۶۔ مدینۃ الانوار۔ اس مثنوی کا مصنف غلام اعزاز الدین مستقیم جنگ ہے۔ نامی تخلص تھا۔ عمدۃ الامرا فرماں روا ارکاٹ نے نامی کو اپنے دربار کا ملک الشعرا مقرر کیا تھا۔

نامی کی کئی ایک مثنویاں ہیں۔ مثلاً لیلیٰ مجنوں، شیریں خسرو، قصہ بنارس،

سلیمان نامہ، وفات نبیؐ، دیوان وغیرہ۔ حیدرآباد کے کتب خانوں میں اُن کے مخطوطات موجود ہیں۔ نامی کی یہ مثنوی ۱۲۱۳ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اس مثنوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت سے واقعات درج کئے گئے ہیں۔ یعنی آپ کا آخری حج، بیمار ہونا، انتقال فرمانا۔ انتقال کے بعد کے واقعات تفصیل سے نظم کئے گئے ہیں۔ کتاب کے موضوع اور نام کتاب کا تذکرہ خود مصنّف نے اس طرح کیا ہے۔

فضل سے حق کے اب بحسن تمام — ہوگیا یہ وفات نامہ تمام
اس رسالے کو میں نے کر تیار — نام رکھا مدینۃ الانوار
ختم کر جب وفات کا احوال — اس کی تاریخ کا کیا میں خیال
سن کے ہاتف نے یہ کہا ورد — صلوٰۃ خدا بنی پر ہو

۱۳ ۱۲ھ

---

کلام کا نمونہ پیش ہے۔

ہو گئے جتنے عالمان جلیل! — یوں کئے اس بیان کی تفصیل
سن ہجری ہوئے ہیں گیارا جب — مصطفیٰ کی عمر تھی ترسٹ تب
دن تھا شنبے کا اور ماہ صفر — ماہ دنیا سے کر چکا تھا سفر
یعنی تاریخ بست وششم تھی — روشنی اس کی سر بسر گم تھی
ہوا اُس دن سے نبی بیمار — درد سر تھا اور اسپو تپ کا بخار
پایا اپنے کو جب ذرا سا علیل — حکم سے حق کے پھر خدا کا خلیل
مرتضیٰ کا وہیں پکڑ کے ہاتھ — اور اصحاب کو بھی لے کر سات
چل دیا تھا بقیع غرقد کو — دیکھنے دوستوں کی مرقد کو
گور پر اُن کے آ سلام کیا — واسطے اُن کے پھر دعا مانگا

بعد اصحاب کے طرف منہ کر — یوں لگا کہنے دین کا سرور

مجھ کو ہر سال میں امین خدا — مصحف اک مرتبہ سناتا تھا

اب کے باری سنایا دو باری — موت کی ہے مگر یہ تیاری

۱۷۔ ریاض السّیر۔ اس مثنوی کا مصنف غلام محمود حسرت ہے۔ مدراس وطن اور فاطمی خاندان سے تعلق تھا۔ حسرت دکن کے مشہور صوفی بزرگ شاہ ابوالحسن کے پوتے جو اسی نام سے موسوم تھے کا مرید تھا۔ علمی قابلیت بڑی اچھی تھی۔ عربی فارسی میں پوری دست رس تھی۔

ریاض السیر ضخیم مثنوی ہے۔ اس میں عنوانات کے تحت آنحضرتؐ کی سیرت مبارک کا مفصل تذکرہ ہے۔ نورِ محمدیؐ سے آغاز ہے۔ شمائل، اسوۂ حسنہ کے تذکرہ کے علاوہ ولادت، نبوّت، ہجرت، ہجرت کے بعد کے واقعات مفصل لکھے گئے ہیں۔ آخر پر وفات کے تذکرے کے بعد معجزات، اخلاق، عادات اور آنحضرتؐ کی عبادت کا بیان ہے۔

مصنّف نے بیان کیا ہے کہ اس کو ذوقی کی فارسی کتاب سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ آغاز یہ ہے۔

خدایا سزا وارِ شاہی تجھے — تو صاحب ہے سب خادماں ہیں تیرے

دل و جاں ترے بندہ فرماں مدام — دل و جاں سے ہیں ہم بھی تیرے تمام

کیا ہے جو توں تن کو محکوم جاں — رکھا ہے بہت اس میں حکمت نہاں

صفحات گزشتہ میں جن کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ سب کی سب مثنویاں تھیں۔ دکھنی نثر میں ہم کو صرف تین کتابوں کا پتہ چلا ہے۔ یعنی ریاض السیر۔ ممتاز التفاسیر اور فوائد بدریہ۔

اب ان کی صراحت کی جاتی ہے، امید ہے موجب دلچسپی ثابت ہونگی۔

(۱) ریاض السّیر۔ اس کتاب کے اور دو نام ہیں یعنی حقیقت نور محمدی، اور مولود شریف۔ اس کتاب کے تین قلمی نسخے حیدرآباد کی سنٹرل لائبریری (کتب خانۂ آصفیہ) میں موجود ہیں۔

یہ کتاب علامہ مولانا باقر آگاہ کی تصنیف ہے، اور ۱۲۱۰ھ کے قبل تصنیف ہوئی ہے۔ اولاً نور محمدی کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد آنحضرتؐ کی ولادت کا بیان ہے۔ اس سیرت میں آنحضرتؐ کی پیدائش سے وفات کا حال مختصر طور پر قلم بند کیا گیا ہے۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"مدّت اقامت حضرت کی مدینہ منوّرہ میں بالاتفاق دس برس ہے۔ اس دس برس میں غزوات ساتھ قول مشہور کے بائیس ہیں۔ اور روایت ہے زید بن ارقم سے کہ غزا کئے میں نے ہمراہ حضرت کے سترہ بار، اور کہا ابن اسحٰق اور ابومعشر اور موسٰی بن عقبہ نے کہ مشہور یہ ہے کہ آپ بائیس غزوات میں تشریف لے گئے اور سرایا پچاس ہوئے۔ مقابلہ نہیں فرمایا آپ نے مگر سات ہیں۔ غزوہ بدر، غزوہ احد، غزوہ بنی قریظہ، غزوہ بنی المصطلق، غزوہ خیبر، غزوہ طائف۔ اور بعضے لکھتے ہیں کہ غزوہ وادی السری اور غزوہ نمابہ اور غزوہ بنی النضر میں بھی مقابلہ کیا۔ اور تمام عمر شریف میں تین حج کئے۔ دو حج آگے ہجرت کے ایک حج بعد فرض ہونے حج کے کہ سال چھٹے میں ہوا۔ یہ حج سال دسویں میں حجۃ الوداع تھا۔ اس حج میں سو اونٹ نحر کئے۔ ساٹھ اپنے ہاتھ سے اور چالیس حضرت علیؓ کو دیئے اور چار عمرے کئے بعد ہجرت کے۔

چہارشنبہ کو حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ پر تکیہ لگا کر مسجد میں تشریف لا کر بعد حمد و ثنا کے فرمایا اے لوگوں عنقریب میں یہاں سے عالم بقا کو کوچ کرتا ہوں جس کسی کا حق میرے ذمہ میں ہو تو بتا دو کہ ادا کروں۔ ایک نے عرض کیا یا رسول اللہؐ آپ نے تین اوقیہ دینے کا مجھ سے وعدہ فرمایا تھا، آپ نے تین اوقیہ فضل بن عباسؓ سے اوس شخص کو دلوا دیے۔ جمعہ کے دن پھر مسجد میں رونق افروز ہو کر خطبہ پڑھا اور بہت سے تبلیغ احکام کی تعلیم فرمائے۔ بعد فراغ نماز کے میمونہ کے گھر تشریف لے گئے۔ وہاں زیادہ تر غلبہ مرض کا ہوا۔ عائشہ صدیقہ فرماتے ہیں کہ ابتدا مرض کی میمونہ کے گھر میں ہوئی تھی۔ وہاں سے میرے حجرے میں قدم رنجہ فرمایا۔"

(۲) **فوائد بدریہ**۔ یہ دکھنی زبان کی سب سے آخری سیرت النبیؐ ہے جو نثر میں لکھی گئی ہے۔ اس کے مصنف مولوی محمد صبغتہ اللہ المخاطب قاضی بدالدولہ ہیں۔ فوائد بدریہ ۱۲۶۱ھ میں تالیف ہوئی ہے۔ آج تک کئی مرتبہ مدراس، بمبئی، بنگلور اور حیدرآباد میں شائع ہوئی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آج تک اس کتاب کی مانگ ہے۔

مولوی صبغتہ اللہ ۱۲۱۱ھ میں مدراس میں تولد ہوئے۔ وہاں ہی ۱۲۸۰ھ میں انتقال ہوا۔ آپ نے اپنے زمانہ کے جید علماء سے تعلیم حاصل کی تھی۔ جن میں مولانا عبدالعلی بحرالعلوم ملک العلماء فرنگی محلی جیسے امام وقت اصحاب شامل ہیں۔ مولوی صبغتہ اللہ تفسیر، حدیث، فقہ، فلسفہ، تاریخ کے ساتھ ریاضی، ہیئت اور طب میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ نواب غلام محمد غوث خاں والئ ارکاٹ نے آپ کو خدمات صدارت، قضائت وغیرہ پر مامور کر کے بدرالدولہ، قاضی الملک، امام العلماء کے

خطاب سے مخاطب کیا تھا۔

آپ ایک بلند پایہ مصنّف تھے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سے اردو کتابوں کی تعداد ذخیرہ ہے۔ جو تفسیر، فقہ، عقائد، سیر، مناسک وغیرہ فنوں پر مشتمل ہیں اور اردو نثر ہی میں قلمبند ہوئی ہیں۔ چونکہ آپ کی زبان بلحاظ ارتقا تدریجی باقر آگاہ سے زیادہ صاف تھی، اس لئے اب باقر آگاہ کی کتابوں کی جگہ آپ کی کتابوں نے لے لی۔ فوائد بدریہ خاصی ضخیم کتاب ہے۔ اس کے دو باب ہیں۔ پہلے باب میں آنحضرتؐ کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات، بعثت اور ہجرت کے سنین کے لحاظ سے بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں صورت با جمال اور سیرتِ با کمال کا تذکرہ ہے اس میں معجزات بھی لکھے گئے ہیں۔ شمائل کا ایسا بے مثل خلاصہ مرتب کیا ہے۔ "فوائد بدریہ" کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو تمام تر احادیث سے مرتّب کیا گیا ہے اور صحیح حدیثوں کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ عبارتِ کا نمونہ حسبِ ذیل ہے۔

"پہلا سال ہجری۔ اس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبا میں مسجد بنائے، اور جماعت سے علانیہ نماز پڑھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکّے سے نکلنے کے بعد علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، حضرت کے تمام امانتاں وغیرہ ادا کرکے ہجرت کئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے بعد تیسرے روز مدینے کو پہنچے اور قبا میں اترے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبا میں چودہ روز رہ کے پھر جمعہ کے روز دن چڑھے وہاں سے نکلے اور راہ میں رانوا کر ایک مقام تھا اور اس میں بنی سالم بن عوف رہتے تھے سو وہاں نماز جمعہ پڑھ کر پھر

سوار ہوئے اور مدینے کی طرف روانہ ہوئے"

ایک اور نمونہ :-

"آنکھیں حضرت کے بڑے تھے اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ اور حدقہ بہت سیاہ تھا۔ جب حضرت دیکھتے تو پورا دیکھتے اور آنکھیں نیچے کرتے۔ پیشانی مبارک کشادہ تھی۔ اور بھواں دونو ملے ہوئے کمان دار تھے۔ اور اس کے موے پورے تھے۔ بینی مبارک ہموار باریک اور بیچا پیچ تھی۔ اور دہن شریف بلند تھا۔ دندان مبارک سفید روشن براق آبداری اور رونق کے ساتھ تھے"

اس نمونۂ عبارت سے واضح ہو سکتا ہے کہ قاضی بدرالدولہ نے کس محنت اور کوشش سے اپنی تالیف فرمائی ہے، اور عربی الفاظ کا ترجمہ کس خوبی سے کیا ہے۔ فوائد بدریہ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آج تک اس کی مانگ ہوتی ہے۔

(۳) مختار التفاسیر۔ اگرچہ اس کتاب کا نام مختار التفاسیر ہے۔ مگر اس میں آنحضرتؐ کی سیرت مبارک کا تذکرہ ہے، اس مثنوی کے مصنف سید امیرالدین حسین ہیں اور ۱۲۵۰ھ کے بعد تصنیف ہوئی ہے۔ مصنف واعظ تھے۔ اپنے وعظ کے سلسلہ میں یہ مثنوی تصنیف کی ہے۔ مثنوی کو کئی ایک باب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) بیان درود شریف (۲) نور محمدی (۳) مولود شریف (۴) رضاعت (۵) مناقب (۶) شمائل (۷) علامت محبت رسول (۸) اخبار رسول (۸) نزول وحی (۹) معراج (۱۰) تفسیر آیت اوّل (۱۱) بیان وحی آخر (۱۲) ہجرت (۱۳) شرائط محبت (۱۴) وفات آنحضرت۔

ممتازالتفاسیر کی عبارت کا نمونہ یہ ہے۔

"عتبہ آپ کی مجلس سے اوٹھا اور اپنی قوم میں گیا اور کہا واللہ میں نے ایسا کلام نہیں سنا تھا مصلحت یہ ہے کہ اُن کی ایذا رسانی میں مبالغہ مت کرو، قوم نے کہا تجھ پر محمدؐ کے سحر نے اثر کیا، جب کفار بہت ایذا دینے لگے، آپ نے بعض صحابہ کے حق میں مصلحت جان کر ملک حبش کو حکم ہجرت فرمائے۔ گیارہ مرد اور چار عورتیں ملک حبش کو گئی۔ چھٹے سال ہجرت سے حضرت حمزہؓ مشرف باسلام ہوئے۔ اُس وقت عدد مسلمانوں کا انتالیس کو پہونچا۔ بعد اون کے حضرت نے دعا فرمائے کہ اے بار خدا تو عزت دے اسلام کو سات عمر بن الخطاب کے یا ابی جہل بن ہشام سے حضرت عمرؓ کے حق میں دعا حضرت کی قبول ہوئی۔ ابوجہل نے اشتہار دیا کہ جو شخص محمدؐ کو قتل کرے گا میں اُسے سو اونٹ سرخ اور چالیس ہزار درم دوں گا۔"[85]

صفحات گزشتہ سے اس امر کا بخوبی پتہ چل سکتا ہے کہ دکھنی (قدیم اُردو) شعراء اور نثر نگاروں نے آنحضرتؐ کی سیرت مبارک کے متعلق کیا کام کیا ہے اور کس طرح اُردو میں سیرت مقدس کے لکھنے کی بنا ڈالی تھی۔ اگرچہ یہ صحیح ہے، اکثر کتابوں میں صدق کے ساتھ بہت کچھ کذب بھی شامل کر دیا ہے۔ صحیح حدیثوں کے ساتھ غیر معتبر واقعات بھی لکھے گئے ہیں۔ مگر اس امر کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اُس زمانے میں روایت کی جانچ کے لئے درایت کا طریقہ رائج نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ ماحول اور فضا ایسی تھی کہ افسانے کی صورت ہی عام طور پر مقبول تھی۔ اس لئے شعراء اس کو داستان کی صورت دیا کرتے تھے۔

[85] رسالہ مصنف علی گڈھ

# قدیم اردو کے قصص انبیاء

دکھنی یا قدیم اردو کی چھان بین کی جائے تو عشق و محبت کی داستانوں کے علاوہ تصوف اور مذہب کے متعلق بہت کچھ ذخیرہ ہم دست ہوتا ہے، بلکہ زمانہ قدیم میں اکثر عشقیہ مثنویاں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں کہ ان سے تبلیغ اسلام کا کام لیا جائے، اس قسم کی بیسیوں مثنویاں پیش کی جا سکتی ہیں۔

مذہبی مثنویوں کو بھی کئی اقسام پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ مثلاً آنحضرتؐ کی سیرت مبارک اور معجزات، معراج، ولادت وغیرہ کی مثنویاں۔ دوسرے سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے مناقب، کرامات، حالات وغیرہ۔ دکن میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے بجائے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے زیادہ عقیدت مندی رہی ہے اس لئے حضرت کے متعلق دکھنی زبان میں زیادہ مواد ملتا ہے۔ مذہبی مثنویوں میں فقہ اور عقائد کا ذخیرہ بھی خاصا ہم دست ہوتا ہے۔ حنفی فقہ اور عقائد کے مسائل کی متعدد مثنویاں ملتی ہیں۔ تصوف کا بھی کافی ذخیرہ ہے۔ ضخیم مثنویوں کے علاوہ بے شمار چھوٹے چھوٹے رسالے جو نظم اور نثر دونوں میں قلم بند ہوئے تھے۔ اکثر کتب خانوں میں موجود ہیں۔
ان ہی مذہبی کتابوں میں ہم انبیاء کے قصوں کو بھی شامل کرتے ہیں۔ "یوسف زلیخا"

یہ قطع نظم دیگر کئی مثنویاں مثلاً "سلیمان نامہ"، "مریم نامہ"، "قصۂ موسیٰ" وغیرہ کے ناموں سے لکھی گئی ہیں۔ جن میں سے بعض بمبئی اور مدراس میں طبع بھی ہوئی ہیں۔ انبیاء کے قصوں میں "قصص انبیا" کے نام سے بھی چند کتابیں دکھنی میں مرتب ہوئی ہیں۔ ان میں سے دو کا ہم یہاں تعارف کراتے ہیں۔

(۱) قصص انبیاء مصنف قدرتی

یہ بہت نایاب مثنوی ہے۔ کتب خانہ آصفیہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری میں اس کا ایک قلمی نسخہ (سیر ۱۳۵) پر موجود ہے، سائز (۱۴×۱۰) صفحات (۴۴۶) سطر (۱۲) خط نسخ۔ ناقص الآخر ہے۔ مگر پھر بھی دس ہزار سے زیادہ شعر ہیں۔

---

اس مثنوی کا آج تک کسی نے تعارف اہل علم سے نہیں کرایا ہے۔ راقم نے اپنے ایک مضمون میں جو "نوائے ادب" بمبئی کے جنوری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا ہے کچھ صراحت کردی ہے۔ آج ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں۔
سب سے پہلے اس کے مصنف اور تاریخ تصنیف کا تذکرہ ضروری ہے۔ مثنوی میں متعدد جگہ مصنف نے اپنے تخلص کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ چند شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

سبچن قدرتی ذاتی پھرتا ہے تون ۔۔۔ یو توری درمیانی ترتا ہے نوں

---

کھیا قدرتی قصہ دکھنی کلام ۔۔۔ ابراہیم نبی پر درود و سلام

---

کھیا قدرتی خوب تازہ کلام ۔۔۔ کہ بر صدق یوسف علیہ السلام

---

کھیا قدرتی قصہ ایوب کا ۔۔۔ سُنے کوئی بندہ جو محبوب کا

---

ارے قدرتی قصہ کرتوں بیاں ۔۔۔ یو پیدا ہویاں کیوں ہے جن و پریاں

---

ان اشعار سے یہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ یہ مثنوی "قدرتی" کی تصنیف ہے۔ دکھنی ادب کی جو قدیم اور جدید کتابیں ہمدست ہوئی ہیں اُن میں آج تک قدرتی تخلص کے شاعر کا ذکر نہیں ہے۔ کسی قدیم اور جدید مورخ یا ادیب نے قدرتی کا تعارف نہیں کرایا ہے، اس لئے قدرتی" ایک جدید شاعر ہے جس کو ہم ایک ضخیم مثنوی کے مصنف کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ عادل شاہی دور کی ضخیم مثنوی "خاور نامہ" کے چوبیس ہزار شعر ہیں۔ یہ دوسری مثنوی ہے جس کے دس ہزار سے زیادہ شعر ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ قدرتی پُرگو شاعر تھا۔ افسوس ہے کہ قدرتی کا ہم کو نام معلوم ہے اور نہ اُس کے زمانہ کی اطلاع ہے اور نہ موت کے سنہ کی، جو کچھ واقعات ہم کو اس مثنوی سے معلوم ہوئے ہیں ان کا ہی اظہار کیا جائے گا۔

اکثر دکھنی مثنویوں میں حمد و نعت منقبت اور معراج کے حالات کے بعد بادشاہِ وقت کی مدح اور ستائش ہوتی ہے۔ اس سے کتاب کے زمانہ تصنیف کا پتہ چل جاتا ہے۔ پھر اکثر دکھنی مصنف خاتمۂ کتاب پر تاریخ تصنیف کا بھی ذکر کر دیا کرتے تھے۔

افسوس ہے کہ یہ ناقص الآخر مثنوی ہے۔ خاتمہ کے اشعار نہیں ہیں۔ اس سے تصنیف کی تاریخ معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ کسی بادشاہ کی مدح بھی نہیں ہے۔ اس طرح زمانۂ تصنیف سے ہم بالکل ناواقف ہیں۔ صحیح طور پر اس

مثنوی کی تاریخ تصنیف کی صراحت نہیں کی جاسکتی۔

تعین زمانہ کا ایک ذریعہ مثنوی کی زبان اور طرز بیان ہے۔ اس کے مدنظر ہم اس کو عادل شاہی دور کی تصنیف قرار دیتے ہیں اور کم وبیش ۱۰۵۰ھ کے قریب اس کی تصنیف قرار دی جاسکتی ہے۔

ممکن ہے شاعر کا نام عبدالقادر یا عبدالقدیر یا قدرت اللہ یا محمد قادر وغیرہ کوئی ہوسکتا ہے۔ عادل شاہی دور کے شعراء کے تخلص اکثر اسی طرح پائے جاتے ہیں مثلاً مقیمی، رستمی، نصرتی، ہاشمی، ایاغی وغیرہ اس لئے قدرتی بھی اس دور کا شاعر ہوسکتا ہے۔ اس عہد کی تصنیف قرار دینے کی بڑی وجہ اسلوب زبان اور طرز بیان ہے معلوم ہوتا ہے قدرتی کو شاہی دربار سے تعلق نہیں تھا اس لئے اس نے بادشاہ کی مدح اور ستائش نہیں کی اور عام رواج کے مطابق بادشاہ کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے مذہبی شخص ہونے کا گمان غالب ہے۔ کیوں کہ اس نے اپنے زمانے کے رواج کے مطابق عشقیہ مثنوی قلم بند کرنے کے بجائے "قصص انبیاء" کو اپنے جولانی طبع اور تخیل کی پرواز کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

قدرتی نے کہیں اس امر کا تذکرہ نہیں کیا ہے کہ اس کتاب کو اس نے کس فارسی قصص انبیا سے ترجمہ کیا ہے یا تفسیروں وغیرہ سے مدد لے کر اس نے ذاتی تصنیف کی ہے۔ چونکہ دکھنی شعراء کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب وہ کسی فارسی سے دکھنی میں ترجمہ کرتے ہیں تو اس امر کی صراحت کردیتے ہیں کہ ان کی تصنیف فارسی کا ترجمہ ہے۔ قدرتی نے ایسا نہیں کیا ہے، اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ یہ اسی کی ذاتی تصنیف ہے ترجمہ نہیں ہے۔

کتاب فارسی عنوانات کے تحت لکھی گئی ہے۔ (۲۸) عنوان ہیں جن کی تفصیل

حسب ذیل ہے۔ ہر عنوان کو "قصّہ" کے لفظ سے لکھا گیا ہے۔

(۱) حمد (۲) قصّہ آفرینش عناصر اربعہ آسمان۔ ملائک (۳) تحت الثریٰ۔ (۴) فرش ہائے اربعہ (۵) آفرینش دوزخ (۶) آفرینش گائے (۷) آفرینش پہاڑاں (۸) آفرینش جن و پریاں (۹) محل ابلیس (۱۰) آفرینش آدم علیہ السّلام (۱۱) آدم اور حوّا کا بہشت منی بہادر نکلے سو بیان (۱۲) ہابیل و قابیل (۱۳) وفات آدم (۱۴) شیث و ادریس (۱۵) نوح (۱۶) ہود (۱۷) صالح (۱۸) ابراہیم (۱۹) اسحاق (۲۰) یوسف (۲۱) ایوب (۲۲) فرعون۔ موسیٰ (۲۳) یوشع (۲۴) الیاس (۲۵) شعیب (۲۶) شموئیل (۲۷) شدّاد (۲۸) داؤد (۲۹) سلیمان (۳۰) ذکریا (۳۱) یحییٰ (۳۲) سکندر (۳۳) لقمان (۳۴) اصحاب کہف (۳۵) عیسیٰ (۳۶) جرجیس (۳۷) اصحاب فیل (۳۸) سید المرسلین خاتم النبیین علیہ السّلام۔

چونکہ مثنوی ناقص الآخر ہے۔ اس لئے اس کے بعد کے عنوان نہیں ہیں۔ غالباً آنحضرتؐ کی سیرت پر کتاب ختم ہوئی ہوگی۔

جس بیان پر مثنوی ختم ہوتی ہے وہ حبش کی ہجرت کا بیان ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد بھی آنحضرتؐ کی زندگی کے تقریباً اٹھارہ سال کا بیان اس میں نہیں ہے۔ میرے خیال میں کم از کم اور دو ہزار شعر ہو سکتے ہیں۔ افسوس ہے اس مثنوی کا کوئی اور نسخہ کسی کتب خانہ میں نہیں ہے۔ جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے۔ مثنوی نسخ میں لکھی گئی ہے۔ آغاز میں کچھ دور تک اعراب بھی دیے گئے ہیں۔ آغاز حسب ذیل اشعار سے ہے۔

کہہ الحمدؑ للہ و پروردگار ‌‌‌‌ ‌‌ کیا جگ آپس نور تے آشکار

---

ؑ کوئی اور نسخہ نہیں ہے اس لئے اشعار بجنسہٖ نقل کئے گئے ہیں۔

787
LALI ALI

سرا دن اول میں جو سبحان کون | جکوئی جیو دیا ہے سو سلطان کون
خلیفہ ہے اس کا ہی مصطفےٰ | کہا جس کتیں لیل ہور والضحےٰ
...... نبی کے ولیاں انبیا | اسی سلسلے کا یہ قصہ کیا
...... دین کے سروری بولیا | اسی لاؤں ہے قصص الانبیاء
کیا قدرتی قصہ نز ملا | اچھے سبب کون معلوم و سلسلہ
کہ یک دن نبی سو علی یوں کہے | دنیا دین کس دہات پیدا اسے
کہے یوں محمد سنو یا علی | وہی ذات کات کا نور تھا اولی

---

اس طرح چھبیس شعر ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے نور پیدا کیا، قلم اور عرش پیدا ہوا، عرش کے ستر ہزار برج ہیں اور ہر برج پر اٹھارہ ہزار کنگورے ہیں اور ہر کنگورے میں ایک ہزار قندیل ہیں۔ پھر بیان کیا ہے کہ عرش جھولنے لگا اور خدا نے عرش کو حکم دیا کہ نہ ہل مگر اس کی تعمیل نہیں ہوئی۔ پھر خدا نے "لاحول" پڑھا اس پر عرش کی حرکت موقوف ہوئی۔ آخری تین شعر یہ ہیں۔

نکو ہل کر کر حکم رب نے کیا | کہ اس بات پر عرش چپ نہیں رہیا
کہ لاحول بولیا خدا اس کے تیں | رہیا عرش بات پر چپ کہ ویں
ہو اللہ بھی کام ایسا کیا | جو حکمت ستے حکم ایسا دیا

---

اس کے بعد پہلا عنوان یعنی "قصہ آفرینش عناصر اربع و آسمان و ملائک" شروع ہوتا ہے۔ اب ہم بعض عنوانات سے نمونہ کلام پیش کرتے ہیں۔

آدم علیہ السّلام کا بہشت سے نکالا جانا

کہا باری تعالیٰ کہ دنیا میں جاؤ | ارادا تمارا جکچ ہے سو پاؤ

دیا جبرئیل کوں خدا یوں ندا     کر دو بہشت میں تھے اُن نکوں جدا
کہے جبرئیل آ کو آدم کو دیں     کیا حکم ربّی جواب تم کتیں
تمیں بہشت میں سے تھے و نکلو بہار     کیا یوں حکم منجکوں پروردگار
تمیں بہشت میں ہیا تی ہوئے بے تمیز     کہ آدم، حوّا، سانپ ہور مُرتیز

دتن سات ابلیس کوں باؤ بہار     بسٹو لیا کو انکو زمیں پر اُتار (ڈالدیا)
جو آدم نے تھا صا جنّت میں تھے بہار     دعا عبا دھری معجزے یک ہزار
حوا اک ہنی سے جدا ہر کہی ہور     و آدم حوّا گئے ہور سانپ جھو
بہشت میں سوں ان کو نکالے بہار     سٹے لیا کو چاروں کیتا چار ٹیار (طرف)

---

قصّہ حضرت ہود علیہ السّلام کا آغاز

کہے ہود اے قوم ساری سنو     خدا کی عبادت سو اوّل کرو
تمیں بندگی دل میں دھرنا بھلا     کبر ہور مستی نہ کرنا بھلا
تمیں ساری سمجھو خدا اینک کر     دوسرا نہیں کوئی اسکے بغیر
تمکا یا ہے جو جنت قدر ستے یوں     کھلاتا رزق رو زعزّت تھے یوں
تمیں سب ڈرو ہور بندگی کرو     یہ غفلت سوں کافر ہو کرنا مرو
تمیں پر خلیفہ کیا حق منجے     کھیا ہے خدا یوں کے مطلق منجے
اتھے لوگ اوچے و لمبے بلند     قوی دست در زور قوت میں چند
و او چے قداں سوا یک بیس گز     اگر قد ہے کوتا سو سب تیس گز
و او چے بلند زور بالا دھرے     کہ بیسوں ہوواں کوں نصیحت کرے
تمیں شکر اس حق نعمت کرو     بتاں چھوڑ دے کر عبادت کرو

کہے لوگ سب یوں تری بات کون — کہ کیوں بت پرستی سکیں ہاتسوں
چھوڑیں
بزور حق کیا قحط اس قوم پر — مگر بھوک سوں لیا ئیں ایمان کر
وسب کا فراں میں ستر لوگ آئے — کہ جیوں ہود پر صدق ایماں لیائے

---

حضرت سلیمان علیہ السّلام کے قصّہ کا ایک واقعہ

بچھانے بھلے لیا بچھاتے دہان — وزیراں کے تیں سب بلاتے دہان
و آصف وزیران میں پردھان جو — و بیٹھے جو سیدی طرف جان او
و بعضے وزیران سو حاجب تمام — دیا دیں طرف آکھڑے آپ مقام
پری ہور دیوان ادب کے سنگات — کھڑے رہے دہلی اپنی جوڑ ہات
و مرغان پران کھوال اس ساتھ تھانو پر — کھڑے رہے ابر تخت کے چھانو کر
حکم تب جو کرتے دیا رے کیتن — اوڑا دے پران تخت سارے کیتن
ہوا ہیں ستی دور جاتے اچھین — وسیسیاں کی آواز پاتے اچھین
فرشتے جتے ہے اپر آسمان — جو تسبیح کرتے سو اپنے مکان
بو سنتے اٹھے لوگ سارے وہاں — بجا لیا ڈرتے شکر باری دہان

طویل قصّہ ہے جس میں حضرت سلیمانؑ کا تمام مخلوق کی ضیافت کرنا اور تمام ضیافت کے سامان کو ایک مچھلی کا نگل جانا وغیرہ واقعات کے بعد بلقیس کا قصّہ لکھا ہے اس کے چند شعر یہ ہیں۔

تمیں جا دیا لتی جو بلقیس ٹھار — کھولیوں حقیقت اسون ایک بار
و بلقیس ہوتا مسلمان جو — و گرنیں تو توجان تمن بٹارپو
جو سمجھوں او آکر کریں گے خراب — پکڑ ولیا ینگے اس کے تئیں یاں شتاب

وحاجب جتے آئے سو ایک بار — جو پھر آئے ہیں سب بلقیس نہار
سلیماں کی بزرگی سب تمام — کہے آکے بلقیس کرے مقام
بڑا بادشہ ہور نبی نامدار — نہیں ہے ہو طاقت ہمیں ایکبار
روانہ ہوا دو اپنی فام سون — یمن سوں چلے باٹ لگ شام کون
جو آئے وبیت المقدسؔ کے ٹھار — خبر ہوئی سلیمان کوں ایک بار
وہدہد جو دیکھا اتھا سو خبر — کہیا یوں جو آتی ہے بلقیس کر
کہیا تھا وہدہد جو اس وقت آ — جو تعریف بلقیس کے تخت کا
اتھا تخت روپے کا نفے پائے چار — دیا یان کو سونے کے باگاں سنوار
جو سونے سٹے ہور مینی کو دیں — دو انکھیاں تھے یاقوت کے اس کے تیں
چھ گز کا لمبا ہور چوڑا بی ودیخ — وہدہد جو بولیسا تھا عرض نیخ

حضرت سلیمانؑ کا طویل قصہ ہے۔ اس کا خاتمہ حسب ذیل اشعار پر ہوا ہے۔

وہ دیوان جو دیوک کون لیا ایکبار — دے چھوڑ عدو کے نزدیک ٹھار
وہ دیوک لگے آکر چڑنے کے تیں — وعاصی کیتی آکتر نے کینٹ
وعاصی کون کھایا کتر کر تمام — پڑے ہیں سلیماں کو اس مقام
دیکھے ہیں دیوان موا ہے کگر — لے تخت واتی اچا اپ اپر
لے کر آیا ہے تخت دریا میاں — خدا جان جو بولیا اٹھا اس مکاں
سلا کر سلیمان کون تخت پر — رکھے لیا دو دریا میں اس وقت پر
انگوٹھی سلیماں کے بات ہیں — سو جیوں ہیں کرتے اسے دھات ہیں
آتا لک سلیمان ہے اس مقام — اچھے گا قیامت تلک یو نچ نام

جو دنیا کے سوں کرے تیں وفا
آتا بھی نہ کرے توں رکھ دل صفا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات اگرچہ قصہ سید المرسلین کے عنوان سے شروع کئے گئے ہیں۔ مگر در اصل آپ کے واقعات قصہ اصحاب فیل سے شروع ہو جاتے ہیں کیونکہ اس سلسلے میں عبد المطلب کا حال آگیا ہے۔

| | |
|---|---|
| کہتے ہیں جو سوداگراں شام کون | جو مکےّ سوں گئے تھے اپس کام کون |
| پھر آنے کوں دیکھے اس ٹھار پر | اتھا ایک بت خانہ بت دار پر |
| دمایا سا جو دیکھے دیت کوں شتاب | سبے حال بت خانہ بت کوں عجب |
| چلے آئے واں نے اپس شار میں | و لوگاں جو دیکھے و اس ٹھار میں |
| تماں سب سبے ہے تلے حال کر | خرابی کرے ہے جو بے حال کر |
| جو سوگند کھایا ہے یوں کر تمام | سو مکے منے جا ہمی او مقام |
| جو کعبہ کریں گے ہمیں بھی خراب | و لوگاں کو واں کے جو دیں گے عذاب |
| اتھا پادشہ ابرہہ کرد نام | و لشکر کوں اپنے جمع کر تمام |
| ہتی بہوت تھے اس کنے باندہ صف | دایا ہے لشکر سوں کے طرف |
| و آکر جو مکے کرے بھار تب | جو اتریا ہے لشکر سوا من نہار تب |
| خبر ہوئی ہے عبد المطلب کینن | ہو پادشا یا ہے اس ٹھار دین |

ہاتھی

پھر بیان کیا ہے عبد المطلب اپنے اونٹ کے لئے ابرہا کے پاس گئے۔ اور اونٹ واپس لائے۔ اس کے بعد عبد المطلب کا دس فرزندوں کے لئے دعا کرنا اور پھر عبد اللہ کو ذبح کرنے کا ارادہ کرنا، تمام واقعات لکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد قصہ حضرت سید المرسلین کے عنوان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات شروع ہوتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| مبارک و طالع سئے نیک حال | نکل آئے ہمنہ گرے پیٹ سوں |
| جو سجدہ کے آئے کر بھار دیں | و مینہ جو دیکھے ہے اس ٹھار دیں |

و دونو جو شاتیاں کرے دمیاں  کلیجہ لکھے تھے ہو ظاہر عیاں

اس کے بعد چند شعر مٹ گئے ہیں۔ اس میں آنحضرتؐ کی ولادت کا حال ہے اور بوقتِ ولادت کسریٰ کی حویلی کے گرنے اور سادہ کی ندی خشک ہونے وغیرہ کا حال لکھا ہے۔

ندی ایک سادہ کی تھی درمیاں  سکی خشک ہو کر جوا وبعد ازاں

نجومی مجوسی جتنے ساحراں  جو باطل ہو زیر و زبر یک براں

---

جیسا کہ قبل ازیں لکھا گیا ہے کہ یہ ناقص الآخر مثنوی ہے، آخری بیان حبش کی ہجرت کا ہے۔ مگر چند اشعار مٹ گئے ہیں پڑھے نہیں جاتے۔

...... ہے حبش میں جو ناری اتھے  وچو سار حوش گلناری اتھے

محمدؐ کی بیٹی اتھے ان میاں  و دیکھی ہے ان کوں جو اکر دھاں

جو دیکھی ہے عورت بھی ہور او جمال  کرے صفت ان کا سو حبشاں کی نال

حبش شار میں چور عیار تھے  وچوری منی بھوت پرکار تھے

...... سبھی کرا جوں خبر  وچوراں جو آپس میں عہد کر

...... جاویں سبھی داں کی تین رات کوں  چھوڑ اکر لے کر آئیں ان....

جو ہشتاد چوراں و عیار تھے  وجانے کوں واں سب تیار تھے

اسی شعر پر کتاب ختم ہو گئی ہے۔ اس کے مابعد کے شعر نہیں ہیں۔ اس تفصیل سے قدرتی کے اندازِ بیان کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے گیارہ سو ہجری کے پیشتر کا کلام ہے۔ مزید تفصیلی وضاحت کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس لئے ہم دوسری کتاب کا حال سناتے ہیں۔

---

(۲) قصص الانبیاء۔ اس کا دوسرا نام ریاض مسعود ہے۔

یہ بھی مثنوی ہے۔ کتب خانہ آصفیہ ادارہ ادبیات اردو اور ہمارے خاندانی کتب خانہ میں ایک ایک نسخہ ہے۔ مگر اوّل الذکر دونوں نسخے ناقص الآخر ہیں۔ سالار جنگ کے کتب خانہ میں مکمل نسخہ موجود ہے۔

(۱) کتب خانہ آصفیہ سنٹرل لائبریری نمبر سیرا ۱۷۴ سائز ۱۰ × ۷ صفحہ ۱۲۴ سطر ۱۳ تا ۱۵

(۲) کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو نمبر ۲۵ سائز ۸ × ۵½ صفحہ ۲۹۲ سطر ۱۱۔

(۳) ہمارا خاندانی نسخہ سائز ۱۰ × ۶ صفحہ ۲۴۲ سطر ۱۱ تا ۱۳ خط نسخ

(۴) کتب خانہ سالار جنگ سائز ۱۱ × ۶ صفحہ ۲۳۶۔

یہ ایک مثنوی ہے جو ۱۱۹۱ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اس کے مصنف شاہ غوث جامی ہیں۔ غوث جامی ارکاٹ کے متوطن تھے۔ ایک صوفی منش شخص تھے۔ کسی تذکرہ شعراء یا تذکرہ اولیا میں ان کا حال درج نہیں ہے۔ چند باتیں اسی مثنوی سے معلوم ہوتی ہیں۔ ۱۲۲۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ مدراس کے ایک شاعر متعلی نے تاریخ وفات بھی کہی تھی۔ ہمیشہ انبیاء کے قصے مطالعہ کرتے رہے۔ دوست اور احباب کے علاوہ معتقدین نے قصص انبیاء کو دکھنی زبان میں قلمبند کرنے پر اصرار کیا۔ اسی خواہش پر انھوں نے فارسی قصص الانبیاء سے اس کا ترجمہ کیا، اور ریاض مسعود اس کا نام رکھا۔

مثنوی میں اوّل حمد و نعت ہے۔ خاتمہ میں اپنے بادشاہ والا جاہ کی مدح ہے، اور اس کے بعد نفس مضمون شروع ہوتا ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرتؐ تک کئی انبیاء کا تذکرہ ہے۔ چنانچہ حضرت آدم، شیث، نوح، صالحؑ

ابراہیم، ہود، ادریس، لوط، یوسف، موسیٰ، عیسیٰ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال لکھا ہے۔ اسی سلسلے میں فرعون، شداد وغیرہ کے حالات بھی آگئے ہیں۔ جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے اس کو فارسی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسکی صراحت حسب ذیل ہے۔

تو غوثی انبیا کا ذکر اکثر — زباں سے اپنی کرتا تھا نکوتر
بجد محکوں ہو کے سب اہل محفل — جو رکھتے تھے محبت دل سوں کامل
زباں دکھنی میں اوس کو نظم سو بول — جو آئے فہم میں ہر اک کے تئیں بول
مجھے تحریص سوں ان کے ہوا شوق — رہا میں چین یک تل لے ہوا ذوق
قصص جو انبیا کا فارسی ہے — نظر قران سوں جیوں آرسی ہے
سو اُس کا ترجمہ کرتا ہوں میں اب — مری تو طبع کر جولان یا رب

---

اسی طرح پھر خاتمہ میں ذکر کرتا ہے۔

(اشعار) محمد پور کا غوثی رہنہار — کہتے ارکاٹ جس بلائے کو اظہار
تخلص سب جس کا غوثی ہے نذکو — دلے ہے غوث جامی نام مشہور
زباں دکھنی میں مروارید اولیا — عبارت فرس کی ہندی میں کھولیا

---

آغاز مثنوی ان اشعار سے ہوتا ہے۔

کروں حمد خدا اوّل بیاں میں — ثنا اور صفت اس کی عیاں میں
کیا ارض فلک کو جس نے پیدا — جو کچھ مابین میں اوس کے ہویدا
دیا ہے روز کوں خورشید سوں نور — فلک کو شب کیا تاریاں سے معمور

---

نفسِ مضمون میں اوّلاً "نورِ محمدیؐ" سے بیان شروع ہوا ہے ۔

کروں نورِ محمدؐ کا بیاں اب
ہویدا جس ستے کونین ہے سب

روایت جعفرِ صادق کرے ہیں
خبر باقر سوں او پا کر دئے ہیں

سُنے باقر روایت عابدیںؑ سوں
سُنے عابد حسین شاہ دیںؑ سوں

روایت یو حسین ابن علی سوں
جو پہنچی درجہ درجہ منجلے سوں

حسین ابن علی بولے ہیں ظاہر
نبی کی آپ ہم خدمت میں حاضر

کہ جابر ابن عبد اللہ انصار
محمدؐ کے گئے خدمت میں اظہار

فدا تم پر میرے ماں باپ سلطاں
تمھارے سوں میرے دین و ایماں

اوّل پیدا کیا کیا چیز سبحاں
اپنا فرماؤ اے محبوب رحماں

یو سن کر مصطفیٰؐ فرمائے ظاہر
سنو دل سوں شرح کرتا ہوں جابر

خدا پیدا کیا پہلے مرا نور
کیا مجھ نور سوں کل شئی ظہور

---

نوح علیہ السّلام کے تذکرے میں نوح کا اپنے فرزند کے لئے دعا کرنا ۔

چڑا اُس کوہ پر جا کر او سے آب
پڑا تب دل میں نوح کے بڑا تاب

ہلاکی نوح دیکھے جب پسر کی
اپس فرزند احمق بے بسر کی

خدا کے پاس مانگی یوں مناجات
الٰہی میں عرض کرتا ہوں تجھ سات

کہ اہل البیت سوں میرا پسر ہے
کہ کنعاں اصل میں میرا جگر ہے

ہلاک ہوتا ہے اب پانی میں کنعاں
بچالے فضل کر کر اُس کو رحماں

خدا بولیا نہیں ہے او مسلماں
تمھارے سا نہیں ہے اس کا ایماں

تمھارے ہی لوا اہل البیت سوں بہا
نہیں ایمان لا کر او ہوا خوار

چڑا اتنے میں پانی کود کا تب
سو کنعاں کون بچا پایا پار کر آب ۔

کھڑی کشتی اٹھی پانی اوپر تب
کیا جبریل کے تئیں حکم یوں دب

پڑو کشتی کنے جا کر یو آیت
کریں گی آب سوں کشتی سرایت

سو بسم اللہ کی ہوگی او آیت
پڑے جبریل تا اتمام غایت

چلایا فضل کر کشتی کتئیں رب
لگی چلنے کون کشتی آب پر تب

---

یونس علیہ السلام کے قصے کا کچھ حال ملاحظہ ہو۔

کہے یونس نپٹ ہوں میں گنہگار
ہوں میں ماہی کے کھانے کے سزاوار

مجھے کشتی ستے باھر نکالو
اُٹھا کر سب مجھے دریا میں ڈالو

سنے سب اہل کشتی اُن کی گفتار
کہے ان ستے ہو تم زاہد نکوکار

تمہارے سوں ہوا نئیں گنہگار
تمہارے سوں زیادہ ہیں تباہ کار

گنہ ہر ہر نفس سوں کر کو اظہار
گئے سب سامنے مچھلی کے اک بار

سو تب مچھلی کسی کو بھی نہ کھائی
کسی پر بھی او ماہی نیں بجھائی

مچھلی ماہی کے یونس پیشتر جا
کہے عاصی ہوں اے ماہی مجھے کھا

نگل یونس کتیں ماہی گئی تب
سنو یونس مجھے بولا ہے یوں رب

ندی تکلیف تمنا کون رکھو کر
رہو میرے شکم میں تم ہمیسر

شکم میرا کیا زندان تمہارا
تمہارا قید ہے بہوت آشکارا

---

شدّاد کی بہشت کا اس طرح تذکرہ کیا ہے۔

بنایا چار ندیاں کھیر سراسر
بھریا شیر و شہد سے آب لا کر

لگیا ندیاں بہ بہنے شہد ہور شیر
خمر یک میں دوم میں صاف تر شیر

بنے تب چار رخ پر چار میداں
ہر اک میدان لعل و گہر افشاں

سنہے روپے کے کرسی لاک لاکر | او میداں میں رکھا یلا بے حیا خر
---|---
برس سو تین ہیں او پائے اتمام | او جنت کا نھاسی ہمہ سال لگ کام
منگایا دختراں پس خوب صورت | او حوراں کے جگا پر حور مورت
غلاماں خوب رو بھی منگایا | او غلماں کی جگا پر ان کون پایا

جنگِ احد کا بیان اس طرح کیا ہے۔

مدینے پر او آئے پھر وگر بار | احد کے کوہ کنے اُترے بلا عار
نبی نکلے مدینہ سوں ہو تیار | نبی کے سات پر تھوڑے اچھے یار
ہوا تب جنگ حضرت سوں اُحد پر | بہوت کفار کٹ گئے وہاں ہر
اسٹی یک کوہ کے درے سنی راہ | دغا کر کافراں آواں سوں ناگاہ
کرے او مومناں پر تیر باراں | پراگندہ ہوئے تب چند یاراں
علی مرتضیٰ شمشیر لے ہات | قتل کرنے تھے کفاراں کو ذات
کہ لے کر ذوالفقار او شیر یزداں | کرے نابود اکثر مردِ میداں
شجاعت کا علی کے تب پکارا | ہوا دو نوں جہاں میں آشکارا

مثنوی میں غوثی نے اپنے بادشاہ وقت کی مدح بھی کی ہے اور ان کے پاس پیش ہونے کی خواہش بھی ہے، اور اپنے قرضہ کی ادائیگی کے لئے اظہارِ مدعا بھی کیا ہے۔

اتا کہتا ہوں وصفِ شاہِ اعظم | ہمارے ملک کا سلطان مکرم
ہے واللہ باہ اب شاہِ زمانہ | جہاں میں جس کی ہمت کا فسانہ

وہ طالع ہیں ہے ثانی سکندر　　شجاعت میں ہے رستم سوں بھی برتر

دکن ہور ہند سوں محتاج آکر　　لے جاتے ہاتیاں بھر دُر و گوہر

ہے غوثی بھوت سا شہر قصدار　　نکوئی کرتا برا احوال اظہار

یو والا جاہ کا منظور نظر کر　　مراد اس ہیں مری حاصل ہے یکسر

ہے کل کا جوہری او شاہ والا　　دیا حق اس کو پچھانت حق تعالیٰ

نبی پر بھیج کر صلوات ہر دم
کردیا اتمام یو نسخہ مکرم

---

مثنوی میں تاریخ تصنیف کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

برس ہجری اگیارا سو یک انو　　بھرے پر یو بنیا ہے نسخہ نو

ہے نام اس کا سنو جو ریاض مسعود　　ہے تاریخ اس اسم کی بیچ مشہور

ریاض مسعود میں تاریخ ظاہر　　اگیارا سو یک انو یک، نادر

---

مضمون کی طوالت کے خوف سے اسی قدر صراحت پر ہم اکتفا کرتے ہیں،
اگر کوئی خصوصیت سے ریسرچ کرے تو مزید حالات کا انکشاف ہو سکتا ہے۔
مثنویوں کے تعارف کے لیئے ہم نے جو وضاحت کی ہے وہ کافی معلوم ہوتی ہے
ان دونوں مثنویوں کے علاوہ نثر میں بھی ایک قصص الانبیا اسی زمانہ میں لکھی گئی ہے
جس کے مصنف والاجاہ کے بھائی عبدالصمد ہیں۔ انھوں نے قصص انبیا کے علاوہ حدیث اور
تفسیر کی بھی کئی جلدیں دکھنی زبان میں قلمبند کی ہیں۔ اسلئے ان کا تذکرہ علاوہ کیا جائیگا۔
(ز اعظم کراچی)

# قدیم اُردو (دکھنی) میں

## نیچرل شاعری

اردو شاعری کے متعلق یہ عام خیال ہے کہ اس میں نیچرل امور کی ترجمانی اور فطرتی عنوانوں پر خیال آرائی مغربی شاعری کے اثر سے ہوئی ہے اور یہ مغربی مضراب ہی کا ایک سر ہے جو اُردو شاعری کے بربط سے نکل رہا ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اردو کی جدید شاعری کے متعلق یہ خیال بڑی حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن قدیم اردو شاعری کے متعلق یہ رائے صحیح نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ دکھنی میں نیچرل شاعری کا وجود اس وقت سے ہے جبکہ مغربی شاعری سے کوئی واقف بھی نہیں تھا۔ اور نہ مغربی شاعری کے اثرات شروع ہوئے تھے۔

اس موقع پر اولاً نیچرل شاعری کی توضیح کرنی چاہیئے۔ اس کے متعلق مولانا حالی نے اپنے "مقدمہ شعر و شاعری" میں حسب ذیل صراحت کی ہے۔

"نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیت سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہے۔ لفظاً نیچرل

کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہے جس میں وہ شعر کہا گیا ہے۔

معناً نیچرل ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں"۔
(صفحہ ۹۸)

مولانا عبدالسّلام ندوی نے اس کے متعلق اعتراض کرکے وضاحت فرمائی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

"مولانا حالی نے اپنے دیوان کے مقدمے میں نیچرل شاعری کی جو تعریف کی ہے اس بناء پر مثنوی، غزل اور قصیدہ غرض قدیم شاعری کے تمام اصناف جن میں یہ تعریف صادق آسکے نیچرل شاعری میں داخل ہوسکتے ہیں اور خود مولانا حالی نے مثنوی اور غزل کے متعدد اشعار کو نیچرل ثابت کیا ہے۔ لیکن اس دور میں اس لفظ کا اطلاق صرف مناظرِ قدرت اور وصف نگاری میں محدود ہوگیا ہے، اور عام طور سے جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے یہی دونوں صفتیں مُراد ہوتی ہیں"۔ (صفحہ ۱۳ ا، شعرالہند جلد اوّل)

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اب فطری شاعری یا نیچرل شاعری صرف مناظرِ قدرت پر خیال آرائی اور وصف نگاری کا نام ہے۔ مناظرِ قدرت اور وصف نگاری کے متعلق بھی وضاحت ضروری ہے۔ مناظرِ قدرت میں جذبہ انگیز چیزیں شامل کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً چاندنی، برسات، بہار، جنگل، پہاڑ، پھول، پھل، چرند و پرند وغیرہ۔ جب شاعر ان میں سے کسی کے متعلق اظہارِ خیال کرے تو اس کو

منظر نگاری کہا جائے گا۔

وصف نگاری میں موجوداتِ عالم کی حقیقت اور ان کے مخصوص اوصاف نمایاں کئے جاتے ہیں۔ اس میں مصنوعی چیزیں مثلاً باغ کی آرائش و زیبائش کسی جلوس یا دربار کی صراحت، برات اور رسومات وغیرہ کا تذکرہ ہو تو اس کو وصف نگاری سے موسوم کیا جاتا ہے۔

قدیم اردو شاعری میں میر حسن۔ میر انیس کے بعض نمونے اور نظیر اکبرآبادی کے کلام میں اس قسم کی نظمیں ملتی ہیں۔ حاتم نے بھی ایک دو نظمیں لکھی ہیں بقول مولانا عبدالسلام ندوی یہی قدما کا سرمایۂ نیچرل شاعری ہے لیکن دکھنی شاعری کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں نیچرل شاعری کا بہت زیادہ ذخیرہ دستیاب ہوتا ہے اور جدید شاعری نے جو ترقی نیچرل شاعری میں کی ہے اس کے کئی ایک امتیازات دکھنی شاعری میں پائے جاتے ہیں اور اُردو کی جدید شاعری میں نیچرل شاعری کے متعلق جو امتیازات موجود ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) جدید شاعری میں مناظرِ قدرت میں بہت زیادہ تنوع پیدا کیا گیا ہے۔ اور ہر قسم کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔

(۲) قدما کی طرح صرف بہار، خزاں کے فرضی مناظر نہیں دکھاتے، بلکہ کشمیر، سیر دہرہ دون، دہقان کے کھیت، گنگا، جمنا، جنگل وغیرہ اصلی مناظر پر اظہارِ خیال ہوا ہے۔

(۳) قدیم شعراء کے یہاں محاکات سے زیادہ تخئیل کا عنصر پایا جاتا ہے۔ وہ نیچرل تصویر پوری طرح نہیں کھینچتے۔

یہ اور اسی قسم کے امتیازات جدید شاعری کے لوازم اور خصوصیات ہیں، اگر دکھنی نیچرل شاعری پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے اس میں بھی کئی امتیازات موجود ہیں

جو نیچرل طریقے سے اہم حیثیت رکھتے ہیں۔

اس تفصیل کے بعد اب میں قدیم اردو نیچرل شاعری کا تعارف کراتا ہوں، دکھنی زبان کی شاعری کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں منظر نگاری کئی طرح سے ہوئی ہے۔ مثلاً موسم (بارش، گرمی، سردی) بہار و بسنت۔ نوروز، پھول و پھل۔ سبزہ و ترکاری وغیرہ۔ اسی طرح وصف نگاری میں شاہی محل و ایوان، عیدین، رسومات، شادی و بیاہ، کھیل تماشے وغیرہ کے متعلق بھی نظمیں دستیاب ہوتی ہیں۔ جن شعرا نے منظر نگاری اور وصف نگاری کے متعلق زیادہ خیال آرائی کی ہے یہاں اُن کی کسی قدر صراحت کی جاتی ہے۔

**سلطان محمد قلی** قدیم اردو یا دکھنی شعرا میں سلطان محمد قلی قطب شاہ ایک ایسا شاعر ہے جس نے منظر نگاری اور وصف نگاری کے موضوع پر بہت زیادہ اپنے طائرِ خیال کو پرواز دی ہے۔ اس کے کلیات میں کئی نظمیں نیچرل شاعری کی حیثیت سے ممتاز ہیں۔ اُس نے نیچر کے متعدد امور کو جولان گاہ بنایا ہے اور طرح طرح سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ جن جن موضوع پر اُس نے طبع آزمائی کی ہے وہ یہ ہیں۔

موسم بارش، سرما، بسنت، نوروز، ہلال عید، ترکاری، پھول و پھل، سالگرہ، رسم جلوہ۔ دیگر رسومات شادی بیاہ۔ شبِ معراج، عیدِ رمضان۔ عید غدیر۔ عید اضحیٰ۔ عید مولود نبی۔ چوگان بازی وغیرہ۔

دکن میں اگرچہ موسم بہار نہیں ہوتا، مگر موسم بارش ہی یہاں کا زمانۂ بہار ہے۔ دکن میں نہ تو بنگال اور آسام اور سواحلِ ملیبار کی طرح کثرت سے بارش ہوتی ہے اور نہ بعض اضلاع مدراس اور راجپوتانہ کی طرح اس کی کمی ہے۔ اس افراط اور تفریط کے نہ ہونے کی وجہ سے موسم بارش نہایت خوشگوار رہتا ہے۔

نہریں، ندی، نالے چلنے لگتے ہیں۔ تالاب پُر ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف سبزہ زار سے زمرّدی فرش بچھ جاتا ہے۔ کھیت لہلہانے لگتے ہیں جنگل اور بیابان تازگی اور شادابی کا ایک ایسا منظر پیش کرتے ہیں جو نشاط افزا اور سرور انگیز ہوتا ہے۔ چوپائے اور جاندار، غذا اور پانی کی افراط کے باعث تنومند ہو جاتے ہیں۔ باغوں میں رنگ برنگ کے پھول بہار دینے لگتے ہیں۔ غرضکہ موسم بارش دکن میں دامانِ باغباں اور کفِ گل فروش کے لئے اپنی نمود و نمائش کا سامان مہیّا کرتا ہے۔

سلطان محمد قلی نے اپنی کئی نظموں میں موسم بارش کا تذکرہ کیا ہے، اور مختلف انداز سے اس نے اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ سلطان کی ان نظموں سے نہ صرف منظر نگاری کا کمال ظاہر ہوتا ہے بلکہ اس وقت کی معاشرت اور تمدّن کے متعلق بھی بہت ساری باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

مثلاً ان نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ موسم بارش کے آغاز یعنی مرگ کے دن سلطان بہت دھوم دھام سے ایک جشن مناتا تھا۔ شراب کے دور چلتے۔ مطربانِ خوش نوا نغمہ طرازی کرتے۔ رقص و سرود کے کمالات دکھائے جاتے۔ باغوں میں جھولے ڈالے جاتے۔ شاہی بیگمات بیر بہوٹیوں کے رنگ کے سُرخ کپڑے زیب تن کرتیں۔ مُشک، زعفران، عنبر مل کر حسینانِ جہاں جھولوں میں جھولا جھولتیں۔ شاہی قصر اور ایوان میں زمرّدی رنگ کی مسندیں بچھا دی جاتیں۔ ایک مختصر نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

مرگ مہینے کون ملائے ملسکاں مل گگناں میں

صد موتیاں کے جو برسائے سو بھرئے انگناں میں

دھرت بند چیر جو اہر چوبلی رنگ باچ کر انگ پر
بیر بہوٹیاں لعلاں سون اترے ہیں بمیناں میں

کو کے چو ندھر نتھے میوراں ہرے بن چوطرفاں دیکھ
پنکھی زنگارنگی نغمیں کریں مست ہو چمناں میں

ہرے صحرا میں نہ ہوے لالی گلالال تھوی بن میں
شبنمی تیل سوں شمعاں جوں زمرد لگناں میں

موہنیاں نازے طراوت سوں سرنگ تنگ انگ کی اری
جھونے بند چھند سوں لٹکتیاں جوبناں لے جوباں میں

امرت او صاف بچل سات ہے ظلمات سوں چھٹیں
یا نخچل دو بدلاں سیام ہے جوبن کے کھناں میں

دیکھ عجب چھند دو نین مچ رہے حیراں ہو کے یوں
جو اہے کیوں لگناں آپ سوں کنچک کسناں میں

کرنے نظارے ہوا کے پیا لی مے مست سہیلیاں
مبگ مہار بھونر گا ئے سو تن تن سمناں میں

نہ ہوئے مشکیں بھنوراں دو جو وطن کر رہیں پھل میں
نرمل آ چھے ہیں تلاں دو سمناں سے ذقناں میں

سر تئے پگ لک جو مکلل ہو تر سیے سنے سکیاں
من ہرن مچ لبد ایاں گھنگھرو ہو بنجنیاں میں

خوش نبیؐ ہور علیؓ کے صدقے غزل مرگ کی کہیں
سو قطب نور سوں مچ ترے کہ جوں سورج کرناں میں

---

یہ طویل نظم ہے اب ہم اس کا خلاصہ ڈاکٹر زور کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں، جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلطان نے کس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

"آسمان پر فرشتوں نے مرگ کے چھینٹے کو دعوت دی اور خوشی میں سمندر کے موتیوں کو آسمان سے برسایا، جن سے ہمارے صحن بھر گئے۔ زمین نے سر پر جواہر کی پگڑی باندھ لی اور تن میں کانچ کے رنگ کی چولی پہن لی۔ لعل سیمیں جیسی بیر بہوٹیاں تمام جنگلوں میں نکل آئیں۔

ہر طرف ہرے بھرے جنگل دیکھ کر چاروں طرف مور کوک رہے ہیں اور رنگ برنگ کے پرندے چمنوں میں مست ہو کر نغمے گا رہے ہیں۔

ہر جنگل میں لال لال پھول نہیں ہیں بلکہ زمرد کے لگنوں میں شبنمی تیل سے شمعیں جل رہی ہیں۔ اس تازگی اور طراوٹ کو دیکھ کر موہنیاں اپنے خوش رنگ جسموں پر رنگ برنگ کے لباس پہن اپنے جوبنوں کی بہار دکھاتی ہوئی ناز و ادا کے ساتھ محوِ خرام ہیں۔

ان کے آبِ حیات جیسے صاف و شفاف پستانوں کے ساتھ سیاہ سر پستان ظلمات کی طرح لگی ہوئی ہیں۔ یا جو بن کے پاک و صاف آسمانوں پر دو کالے بادل چڑھ آئے ہیں۔

ہوا کا نظارہ کرنے کے لئے مست سہیلیوں نے شراب پی لی ہے اور چنبیلی کے پھولوں میں بھونرے ملہار کے گیت گاتے پھر رہے ہیں۔ یہ مشک جیسے سیاہ بھونرے نہیں ہیں جو پھولوں کو اپنا وطن بنائے ہوئے ہیں بلکہ چنبیلی جیسی نرمل سفوڑیوں کی کالی کالی تلیں ہیں۔

زرّیں لباس میں سکھیاں سر سے پاؤں تک زرق برق نظر آرہی
ہیں اور اُن کے گھنگرو میرے دل کو لبھا کر مچھلی کی طرح بے تاب
بنادیا ہے۔"

موسم بارش اور آغاز بارش کے متعلق سلطان محمد قلی کی سولہ نظمیں ہیں۔
جن میں اس نے مختلف نہج سے اپنے طائرِ خیال کو پرواز دی ہے۔ بسنت وہ تہوار
ہے جس کو ہندو موسم بہار کے آغاز پر مناتے ہیں۔ ہندوستان میں بہار کا موسم
وسط مارچ میں سمجھا جاتا ہے۔ جب پھولوں کی کثرت ہوتی ہے۔ سلطان محمد قلی اس
تقریب کو نہایت کروفر اور شاندار طریقے پر مناتا تھا۔ بسنت کے متعلق اس کے
کلّیات میں۔ چودہ نظمیں ہیں جو رنگینی اور برجستگی کے لحاظ سے خاص طور پر
قابلِ تذکرہ ہیں۔ چونکہ وہ خود رنگین مزاج اور عیش پسند واقع ہوا تھا اس لئے
ان نظموں میں خصوصیت سے عریانی کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ ان نظموں سے یہ
بھی معلوم ہوتا ہے کہ بسنت کے موقع پر قصر وایوان اور باغوں میں پھولوں
کے انبار جمع کر دئے جاتے ہیں۔ حوضوں کو رنگوں سے بھر دیا جاتا اور دل
کھول کر رنگ کھیلا جاتا۔ ایک نظم کا کچھ نمونہ ملاحظہ ہو۔

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا — تمیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا
بچھل کُندن کے تاراں انگ جھونا — بندی ہوں چھند بندسوں کر سنگارا
بسنت کھیلیں ہمیں ہور ساجنا یوں — کہ آسمان رنگ شفق پایا ہے سارا
شفق رنگ چھپنے میں تارے مگٹ جوں — سورج کرنا نمن زرتار تارا
پیا پگ پر ملا کر لیائی پیاری — بسنت کھیلی ہوا رنگ رنگ سنگارا
جوبن کے خوضی سے رنگ مدن بھر — سو رو مار دم چرکیاں لائے دھارا
بھنگی چولی میں کٹیں نس نشانی — عجب سورج میں ہی کیوں نس کوں ٹھارا

بسنت ونت جھد سو کندن گال اوپر  پھولا یا آگ کیسر کی بہارا
نبی صدقے بسنت کھیلیا قطب شہ
رنگیلا ہو رہیا تر لوک سارا

---

اس کا بھی خلاصہ ڈاکٹر زور کے الفاظ میں یہاں پیش کیا جاتا ہے۔
"اے پیارے آؤ عشق کی بسنت کھیلیں، کیوں کہ تم چاند ہو
اور میں تارا ہوں۔ میرا جسم خالص کندن کی طرح چمک رہا ہے،
اور میں سنگار کر کے ہر طرح آراستہ ہوں۔
ہم اور ہمارا ساجن اس طرح بسنت کا رنگ کھیلیں جیسے
آسمان شفق کی وجہ سے رنگ برنگ ہو جاتا ہے۔
شفق کے رنگ کے پیچھے سے جس طرح تارے جھلکنے لگتے ہیں
اسی طرح ہمارا سورج کی کرنوں جیسے تاروں سے بنا ہوا لباس
جھلکنے لگا۔
پیاری بسنت کو پیا کے قدموں سے مل کر لے آئی اور کچھ
اس طرح بسنت کھیلی کہ رنگ رنگ کو سنگار حاصل ہو گیا۔
اپنے جوبن کے حوض خانوں میں عشق کا رنگ بھر کر جسم کے
روئیں روئیں میں بجلی کی رَو دوڑا دیتی ہے۔
رنگ سے بھیگی ہوئی چولی میں سے سرپستاں رات کی نشانی
بن کر سیاہ نظر آتی ہے، اور اس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ
سورج (جیسے پستان) کے بیچ میں رات کو کیسی جگہ مل گئی۔
بسنتی رنگ کے جسموں اور کندنی گالوں سے ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ کیسر کی آگ کی بہار پھل پھول رہی ہے۔

نبیؐ کے صدقے میں قطب شاہ نے ایسی دھوم کی بسنت کھیلی

کہ تینوں عالم رنگیلے ہو رہے ہے"

سلطان محمد قلی کو پانی، سبزہ اور روشنی سے بڑی دلچسپی اور محبت تھی جس طرح موسم بارش کے متعلق اس کی متعدد نظمیں ہیں۔ اسی طرح شب برأت کے متعلق بھی اس نے دل کھول کر اپنی طبیعت کی جولانی دکھائی ہے۔ شب برأت کے عنوان پر اس کی دس نظمیں ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شب برأت کو کثرت سے روشنی کی جاتی اور آتشبازی چھوڑی جاتی۔ ایک نظم کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

"شب برات کی وجہ سے تمام راتوں کو شرف حاصل ہوا اور سب راتوں میں شب برأت ہی کو شرف حاصل ہے۔ کثرت چراغاں کی وجہ سے رات ایسی منوّر ہو گئی کہ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر سورج طلوع ہوئے دن نکل آیا ہے۔

زمین کے ان چراغوں کا عکس جب آسمان پر پڑا تو وہ بھی آئینہ کی طرح جھلکنے لگا۔ آتشبازی اور چراغوں کی وجہ سے دنیا ایسی روشن ہو جاتی ہے کہ اس اجالے کو دیکھ کر آفتاب شرما گیا اور اس شرم کے مارے رات کو بھی اپنا منہ نہیں دکھاتا۔

شب برات میں جو مہتاب چھوڑے جاتے ہیں تو اُن کی تابانی ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ظلمات میں آب خضر گلشن میں جب پھلجھڑیاں چھوڑی جاتی ہیں تو زمین پر چاند سورج اور تارے اُتر آتے ہیں اور اُن کی روشنی کی جھلک آسمان تک پہنچ جاتی ہے۔ خدائے تعالیٰ نے قطب شاہ کو ایسی تجلّی بخشی کہ اس نے رات کو دن سے زیادہ

روشن کرکے چمکا دیا"۔

سلطان محمد قلی نے اپنے شاہی قصر و ایوانوں اور باغوں مثلاً خدا داد محل، محل کوہ طور، سجن محل، اعلیٰ محل۔ باغ محمد شاہی وغیرہ پر کئی نظمیں کہی ہیں۔ قصر و ایوان کی شاندار عمارات ان کی شان و شوکت، باغوں کی سرسبزی و شادابی، پانی سے لبریز حوض۔ پھلوں سے بھرے ہوئے درخت، انواع و اقسام کے میوؤں۔ ترکاری وغیرہ پر خوب خوب دادِ سخنوری دی ہے۔ افسوس ہے کہ مطبوعہ کلیات میں اس کے وہ طویل قصیدے مثنویاں اور ترجیع بند نہیں ہیں جو اس نے اپنے قصر و ایوانوں دیگر عمارتوں اور باغوں پر لکھے تھے۔ اگر یہ دستیاب ہو جاتے تو شائع شدہ کلیات کا حجم دوگنا ہو جاتا۔ یہاں اس امر کا موقع نہیں ہے کہ اس قسم کی نظموں کی تفصیل کی جائے یا ان کا خلاصہ پیش کیا جائے۔ اس لئے ہم صرف ایک نظم کا خلاصہ پیش کرکے سلطان محمد قلی کا بیان ختم کرتے ہیں۔ یہ نظم باغ محمد شاہی پر لکھی گئی ہے۔ بقول ڈاکٹر زور یہ باغ حیدرآباد میں اس جگہ تھا جہاں اب میر عالم کی شکستہ بارہ دری ہے۔ دہلی دروازے کے ایک طرف تواین الملک کا باغ تھا جو اب زنانہ دواخانہ بنا ہوا ہے اور اس کے دوسری طرف باغ محمد شاہی واقع تھا۔ نظم کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔

"محمد قلی کا یہ تمام چمن محمد کے نام سے سرسبز و شاداب ہو رہا ہے اسی وجہ سے اپنے طوبیٰ جیسے درختوں کی وجہ سے یہ چمن جنت کی طرح سہانا معلوم ہوتا ہے۔

جس طرح فانوس کے اندر سے چراغوں کی روشنی خوبصورت نظر آتی ہے۔ اسی طرح دیواروں کے پیچھے سے میوؤں اور پھولوں کے جسم نظر آ رہے ہیں۔ چنپا کی کلی ناک کی طرح نظر آ رہی تھی جس کی دو پتیاں

دو پہلوؤں کی طرح ہیں اور اُس جگہ بھونرے کو تل کی طرح دیکھ کر سب کا دل حیران ہو گیا۔

لاکھوں انگوروں کے خوشے ثریا اور سنبلہ کی طرح دکھائی دیتے ہیں اور اس انگور کے منڈوے کی تازگی کے سامنے آسمان پر انار نظر آتا ہے۔ اناروں میں دانے ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں جیسے یاقوت تیلیوں میں۔ اور کھجوروں کے خوشے مرجان کے پنجوں کی طرح نظر آتے تھے۔ اور سساروں کے لال خوشے دن اور رات کی طرح سیاہ و سفید نظر آتے ہیں۔

ناریل کے پھل زرد کے مرتبانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے تاج کو اہلِ دکن پیالہ کہتے ہیں۔

جامن کے پھل بن میں سالم نیلم کی طرح نظر آتے ہیں۔ اور اس کو اس لئے رکھا ہے کہ دوسرے میووں کو نظر نہ لگے۔

اس باغ کی تعریف و توصیف کے لئے سوسن نے بھی دس باتیں کھولی ہیں۔ اور دکن اپنی سب سندریوں اور حسینوں کی وجہ سے کھلی ہوئی نرگس کی طرح بارونق ہو گیا ہے۔

چمن کا شہرہ سن کر بلبل سب آپس میں خوشی سے الاپ رہے ہیں۔ اور اُن کی آواز سن کر جنت کی حوریں رقص کر رہی ہیں جس کو دیکھ کر درخت مست ہو رہے ہیں، اور اپنے پتّوں جیسے ہاتھوں سے تالیاں بجا رہے ہیں۔ ڈالیاں پھولوں کی شراب جیسی خوشبو سے مست ہو کر ہل رہی ہیں۔ شاید یہ شبنم کی شراب ہے یا کسی کے ہونٹوں کے عرق کا پیالہ۔ یہ بھی اچھا ہے اور وہ بھی اچھی۔ بشرطیکہ اسے عجز

تیرے ساتھ مل کر پینے کا موقع ملے۔"

سُلطان محمد قلی نے اس طرح اپنی نظموں میں تمدّن اور معاشرت کا بیش بہا اظہار کیا ہے۔ عیدوں، تہواروں، شادی بیاہ کے رسوم، کھیل اور تماشوں کے متعلق اُس نے اپنے تخئیل کی پرواز دکھائی ہے۔ اُن کی تفصیل اس موقع پر طوالت کا موجب ہے۔

بہر حال سلطان محمد قلی کی شاعری میں ہم کو نیچرل شاعری کے نہایت عمدہ اور گراں بہا نمونے ملتے ہیں۔

**نصرتی** دکن کا دوسرا زبردست شاعر جس کے کلام میں ہمیں نیچرل شاعری کے عمدہ نمونے دستیاب ہوتے ہیں وہ بیجاپور کا ملک الشعراء نصرتی ہے۔ اس کی تصانیف گلشنِ عشق، علی نامہ اور تاریخ اسکندری نہ صرف واقعہ نگاری کا اچھا نمونہ ہیں بلکہ اگر ان پر نیچرل شاعری کی حیثیت سے بھی نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نصرتی نے وصف نگاری اور منظر نگاری کا بھی بہترین سرمایہ فراہم کیا ہے۔

اس کی مثنوی "گلشنِ عشق" اگرچہ ایک عشقیہ مثنوی ہے مگر اس میں باغ کا منظر صبح کا سماں، چاندنی کی کیفیت، کشتی کی روانی، سردی کا حال، تمازتِ آفتاب وغیرہ کی کیفیت جس طرح واضح کی ہے وہ منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔

نصرتی کا دوسرا شاہکار علی نامہ ہے جو ایک تاریخی اور رزمیہ مثنوی ہے لیکن اس میں بھی نیچرل شاعری کا بہت اچھا ذخیرہ ہمدست ہوتا ہے۔ اس میں نصرتی نے بادشاہ کی تخت نشینی کے جشن، شہر کی آرائش و زیبائش، رعایا کی خوش حالی کا بیان نہایت خوبی سے کیا ہے۔ ایک قصیدے میں موسمِ سرما کی حالت بیان کی ہے۔ سردی کی شدّت، شبنم کی کیفیت، باغوں کی حالت، گُل و گلشن کی پژمردگی کا حال جس قابلیت سے کھینچا ہے وہ نصرتی کی اعلیٰ قابلیت پر بخوبی دال ہے۔

علی عادل شاہ کو جب صلابت خاں پر پوری طرح فتح مندی اور کامیابی حاصل ہوئی اور بادشاہ نے بعد فتح و فیروزی جشن منایا تو نصرتی نے اس موقع پر جو قصیدہ پیش کیا ہے وہ بھی وصف نگاری کی حیثیت سے قابلِ ستائش ہے شہر کی آراستگی، آئینہ بندی، دوکانوں کی آرائش اور زیبائش، لوگوں کی مسرت و شادمانی، گھر گھر خوشی و مسرت کے جلسوں کا ہونا، چراغوں کی کثرت سے رات کا شب مہتاب بن جانا، ہزاروں آدمیوں کا بادشاہ کی سواری کے منتظر بیٹھنا، جدھر دیکھو آدمیوں کا سمندر معلوم ہونا۔ ان میں خورد و کلاں، جوان، بوڑھے مرد اور عورت سب کا شامل ہونا۔ غرضکہ ان تمام واقعات کی نہایت عمدہ وصف نگاری کی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ یہ زندگیٔ جاوید کا مستحق ہے۔

اس طرح نصرتی نے ملیبار کی فتح پر جو قصیدہ پیش کیا ہے اس میں حسن خوبی سے باغ کی تعریف و توصیف کی ہے وہ منظر نگاری کی حیثیت سے قابلِ تعریف ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

ڈوبالی او نیلاب مغرب میں رخش — نکل آئی نس ہو ہسُو فیض بخش
چندر پاک چھاتی تے دھویا غبار — سُورج کا ہوا آئینہ تابدار
دیئے جلوہ خوش نستیی کے حضور — کیا پردہ پردہ نشیناں تھے دور
دیئے جوش پر نور سیلاب کا — ہوا اُتھا کوا چاند سیماب کا
گگن پر نہ ہر ٹھار تارا دسے — کٹورے بھریا سب او پارا دسے
صفائی سوں چندنے کے چار و زمن — جھلکتی تھی بھوئیں صاف آرسی من
فلک اور زمیں پر اتھے نور میں — چھپیا تھا جیا مشک کافور میں
مگر گھُم پہ جا درم صبح کی سٹ — زمیں پر چھپائے تھے اچلا نکٹ
پول اپ وطن میں دھر یا تھا قرار — نہ کوئی پات ہلتا اتھا اس منجھار

سہاتے تھے یوں پھول پھل ڈال پر　　پیالے ہیں چینی کے جوں دود بھر
کھڑا تھا سب اس دھات حوضاں میں فیر
مگر دود کا کر رہے تھے پنیر

---

نصرتی کی منظر نگاری کا نمونہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔ چاندنی کی کیفیت اس طرح واضح کی ہے۔

"رات نے اپنا مشکی گھوڑا مغرب کی دریا میں ڈالا اور فیض بخش دوست بن کر نکلا۔

پاک چاندنی نے اپنی چھاتی سے غبار دھویا اور سورج کا آئینہ (مدور) روشن ہوا۔ تاجدار شب کے حضور میں جلوہ دکھانے کے لئے سب پردہ نشینوں نے پردے اٹھا دیے۔

پُر نور سیلاب کے جوش دینے کے لئے چاند سیماب کا کنواں بن گیا تھا۔ آسمان پر کہیں کوئی تارا نظر نہ آتا، وہ بالکل ایک پارا بھی کٹورا معلوم ہوتا تھا۔

چاندنی کی براقی سے چاروں طرف زمین ابرک کی طرح چمک رہی تھی۔ زمین اور آسمان نور سے بھرپور تھے جس قدر بھی سیاہی تھی وہ سب کا فور (روشنی) میں چھپ گئی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آسمان پر صبح چادر تان دی ہے اور زمین پر شفاف روپہلی چادر بچھی ہوئی تھی۔

اس وقت کوئی پتہ تک نہیں ہلتا تھا، شاید ہوا وہاں سے رخصت ہوگئی تھی۔ ڈالیوں پر پھول پھل ایسے بھلے معلوم ہوتے

ہیں جیسے دودھ بھرے چینی کے پیالے۔

حوضوں میں پانی اس طرح ساکت کھڑا تھا گویا دودھ کا پنیر بنا کر رکھ دیا ہے۔"

گلشنِ عشق کے نمونے کی طرح ایک اقتباس علی نامہ سے بھی پیش کیا جاتا ہے۔

"کوہستان کے منہ پر نہایت دشوار گذار گھاٹ تھا جس کا تنگ راستہ معمہ سے بھی زیادہ موہوم تھا۔

اس دشوار راستے کا نام لیتے ہوئے زبان کا پاؤں ہمیشہ منہ میں پھسل پھسل جاتا تھا۔

اور اس گھاٹ کے نیچے جو کوکن کا علاقہ ہے وہاں روز روشن رات کی طرح نظر آتی ہے۔

اندھیرا نور سے یوں ملا جلا نظر آتا ہے گویا دن شام دیکھو کا جفت ہے۔ اندھیرا اس غضب کا تھا کہ دن کو تارے نظر آتے تھے، اور رصد گاہ والے وہاں بیٹھ کر کام کر سکتے تھے۔

اگرچہ وہ روئے زمین محبوب ہے۔ لیکن سورج کی نظروں سے بھی حجاب میں ہے۔ زمین ایک صاحبِ جمال عورت ہے، اور یہ قطعہ زمین گویا اس کے چہرے کا خال ہے۔ اگرچہ سارے عالم کا اندھیرا وہاں جمع ہے، لیکن اندھیرے میں کئی لاکھ شمعیں روشن ہیں۔

گویا ایک رات میں ہزاروں سورج نکلے ہوئے ہیں اور گلستاں کا نور چھایا ہوا ہے۔

طرح طرح کے حسین پرندے اپنے رقص اور نغموں سے عجب

بہار دکھا رہے ہیں، درخت آپس میں اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ
آسمان کو چھپا لیا ہے اور زمین پر ستاروں کی صرف جھلک نظر
آتی ہے۔

ایک ایک بانس کا یہ حوصلہ ہے کہ وہ آسمان کی چھت پر سے
مکڑیوں کے جالے اُتارنے کا خیال رکھتا ہے۔

بانس آسمان سے یوں بھرے ہوئے نظر آتے ہیں گویا منصوؔ
نوا ایک ہے اور داریں ہزاروں ہیں۔

اس زمین میں شیروں کے خاص گھر ہیں جن کے منہ پر بانسوں
کی گھنی جالیاں بنا رکھی ہیں۔

جا بجا خوں ریز کانٹے نظر آتے ہیں اور ہر قدم پر ہزاروں طشت
اور نشتر موجود ہیں"۔

نصرتی نے علی نامہ میں جنگ کے واقعات اور حالات اس خوبی سے نظم کئے ہیں
کہ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس واقعہ نگاری کا بہترین نمونہ اپنی
مثنوی میں پیش کیا جس کی صراحت کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔

**شاہی** علی عادل شاہ ثانی المتخلص بہ شاہی وہ دوسرا تاجدار ہے جس نے منظر نگاری
اور وصف نگاری کا سرمایہ چھوڑا ہے۔

اگرچہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی طرح شاہی کے دیوان میں نظمیں نہیں ہیں مگر قصائد
وغیرہ میں منظر نگاری کا ذخیرہ موجود ہے۔ شاہی کا ایک قصیدہ علی دا دمحل کے عنوان
پر ہے اس طویل قصیدے میں اس نے وصف نگاری کا بڑا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔
اُس نے اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ قصر کی بنیاد پاتال تک ہے اور اس کی
بلندی آسمان سے ہم کلام ہے، آفتاب اس سے نور حاصل کرتا ہے۔ طاق کسریٰ

کی بلندی اس کا صرف زینہ ہے ۔ حوض کا پانی اس قدر صاف اور شفاف ہے کہ آسمان
معلوم ہوتا ہے ۔ فوارے سے پانی اِس طرح گرتا ہے جیسے موتی گرتے جارہے ہیں ۔
باغ میں قسم قسم کے پھولوں کے تختوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے کئی
پھولوں کے نام گنائے ہیں چنبلی ۔ جوئی ۔ گلاب ۔ سیوطی غرض کہ بیسیوں نام
گنائے ہیں ۔ اسی طرح باغ کے بیسیوں درختوں سرو ۔ شمشاد کی بہار اور دوسری
طرف میووں کے درختوں کی اقسام بیان کی ہیں اور اچھوتی تشبیہوں سے ان کا
بیان کیا ہے ۔ ان سب کی تفصیل طوالت کا موجب ہوگی ۔

## قطب شاہی اور عادل شاہی دیگر شعراء

قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کے دوسرے شعراء جنھوں نے
ایک سے زیادہ مثنویاں لکھی ہیں ان میں جا بجا منظر نگاری اور وصف نگاری کا
حق ادا کیا ہے ۔ ان کی مثنویوں میں صبح، شام، طلوع آفتاب، رات، تاریکی، جنگل،
موسم بہار، محل ایوان، باغ گلشن، پھول اور پھل وغیرہ پر جو اظہارِ خیال ہوا ہے
وہ نیچرل شاعری کا نہایت عمدہ اور کار آمد سرمایہ ہے ۔ اگر ان سب کا تذکرہ
کیا جائے تو ایک دفتر درکار ہے ۔

قطب شاہی دورِ کے بعد مغلیہ زمانہ آتا ہے جب کہ عالمگیر خلد آشیاں کے
عہد میں بھی دکھنی زبان کی شاعری رائج رہی اور اس زمانے کے شعراء نے بھی اپنے
پیش رو شعراء کی طرح مثنویاں لکھی ہیں ۔ مگر اس زمانے میں عشقیہ مثنویوں یا
رزمیہ مثنویوں کے بجائے زیادہ تر تصوف، اخلاق اور سیرت نبی صلی اللہ علیہ
وسلم کے متعلق مثنویاں لکھی گئی ہیں ۔

آخر پر ہم کو ولی کا تذکرہ کرنا ہے جو اس دور کے آخری شاعر ہیں اور جنھوں
نے مثنویوں کے قدیم طرز کو چھوڑ کر غزلوں میں اظہار خیال کا طریقہ رائج کیا اور ان کے

بعد ہی غزل گوئی پروان چڑھی۔ ولیؔ نے بھی وصف نگاری کا ایک نمونہ چھوڑا ہے۔ چنانچہ انھوں نے "سورت" کے متعلق جو نظم کہی ہے وہ وصف نگاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

**تبصرہ:** اس تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے کہ قدیم اردو میں نیچرل شاعری کا بہت کچھ ذخیرہ موجود ہے۔ ہمارے شعراء نے نیچرل شاعری کی حیثیت سے بھی کافی بلند پایہ اور عمدہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے کلام میں تخیل کی پرواز، اسلوب بیان کی جدت، تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت قابلِ داد ہے۔ انھوں نے فطرت کے مختلف اشیاء کو اپنے سخن گوئی کا محور بنایا تھا، اور نیچرل طور سے نہایت عمدہ طور پر دادِ سخن وری دی ہے۔ ان کی جودتِ طبع اور ان کی رسائی ذہن، ان کے بلند پایہ افکار ہر حیثیت سے مستحق ستائش ہیں۔

آج نیچرل شاعری کے نام سے جن امور پر طبع آزمائی ہوتی ہے اور جو خیالات ظاہر کئے جاتے ہیں اُن میں سے بہت سارے مضامین اور موضوع ایسے ہیں جن پر قدیم اردو کے شعراء نے بھی دادِ سخنوری دے دی ہے۔ صرف فرق یہی ہے کہ اُس زمانہ کی زبان آج کل کی زبان کی بہ نسبت زیادہ شستہ اور رواں نہیں تھی لیکن چاہے ہماری زبان آگے چل کر اور زیادہ شستہ اور ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے اور چاہے آئندہ ہماری زبان اور زیادہ نازک اور دقیق مطالب کی مخزن کیوں نہ ہو جائے ہم ابتدائی زمانہ کی ادبی کوششوں کی احسان مندی سے کبھی سبکدوش نہ ہو سکیں گے۔

(رسالہ ساقی فروری ۱۹۵۱ء)

# سلطان علی عادل شاہ ثانی

## اور اُس کی اُردو شاعری

۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ

بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کی ابتداء ۸۹۵ھ سے ہوئی اور ۱۰۹۷ھ میں اس کا خاتمہ ہوگیا۔ دو سو سال کی اس مدت میں نو بادشاہ مسندِ حکومت پر رونق افروز ہوئے۔ یوسف عادل شاہ جس کے نسب کو سلاطینِ عثمانیہ ترکی تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس خاندان کا بانی ہے۔ تاجر کی حیثیت سے بیدر میں آیا، اور سلطان محمد شاہ بہمنی کے مصاحبوں کے زمرے میں داخل ہوا۔ اپنی اعلیٰ قابلیت کے باعث ترقی کرتے ہوئے بیجاپور کا صوبہ دار بنا اور بہمنی سلطنت کے زوال پر اپنی خود مختار حکومت قائم کرلی۔ اس کے بعد اس کا لڑکا اسمٰعیل، پھر پوتا ملو عادل شاہ تخت و تاج کے مالک بنے۔ پھر ابراہیم اوّل اور علی اوّل، ابراہیم ثانی اور محمد عادل شاہ کے بعد علی عادل شاہ ثانی کو تخت و تاج ملا۔ اوّل الذکر تینوں بادشاہوں کے زمانہ میں سلطنت عادل شاہی کو بڑا عروج ہوا سلطنت کے حدود وسیع سے

وسیع ہوتے چلے گئے۔ تمدّن اور تہذیب میں ترقی ہوئی۔ علم وفن کی اشاعت ہوئی۔ بیجاپور علم وہنر کے لحاظ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان کے باہر بھی مشہور ہو گیا۔ دور دور کے علماء اور فضلاء شعراء اور ادیب یہاں جمع ہو گئے۔ تجارت اور حرفت میں بھی خوب ترقی ہوئی۔ اُس زمانہ میں شہر بیجاپور کو آبادی وسعت کے لحاظ سے دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں شمار کیا جاتا تھا اور علم وفن کا مرکز بھی بنا ہوا تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کا یہاں جمگھٹا ہو گیا تھا۔

علی عادل شاہ ثانی جو سلطان محمد عادل شاہ کا اکلوتا چشم وچراغ تھا۔ بیجاپور کا آٹھواں تاجدار ہے۔ ۱۶ ربیع الثانی ۱۰۴۸ھ میں اس کی پیدائش ہوئی سلطان محمد کو اس کے پہلے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے اس کے تولد پر بڑی خوشی منائی گئی۔ غربا کو خیرات تقسیم ہوئی۔ علماء، شعراء، اور امراء کو جاگیروں اور مناصب سے سرفراز کیا گیا۔ شعراء نے قصیدے پیش کئے اور تاریخیں نکالیں منجملہ ان کے خواجگی آقا نے جو قطعہ موزوں کیا تھا اُس کا تاریخی مصرع

مولود شہزادہ گفت کوکبِ شوکت رسید

تھا۔

خدیجہ سلطان شہر بانو جو سلطان محمد عادل شاہ کی ملکہ اور سلطان محمد قطب شاہ والی گولکنڈہ کی دختر نیک اختر تھی۔ اس نومولود کو اپنی آغوش میں لے کر تعلیم وتربیت میں مصروف ہوئی۔ آنند محل شہزادے کے رہائش کے لئے دیا گیا۔ لائق معلم اور قابل مؤدب شہزادے کی تعلیم وتدریس کے لئے مامور کئے گئے۔ اُس زمانہ کی سوسائٹی میں حکمرانی کی قابلیت حاصل کرنے کے لئے جس نصاب کو ختم کرنا ضروری تھا۔ اس کا بااحسن وجوہ انتظام عمل میں آیا۔ اس اہتمام انتظام علمی ماحول قابل اور صاحب تدبیریاں کی تربیت اور نگرانی کا اثر تھا کہ شہزادہ علی اپنے

زمانے کا نامور ادیب، بلند پایہ شاعر، قابل مدبر اور فنون جنگ میں آزمودہ کار سپہ سالار ثابت ہوا۔

باپ کے انتقال پر محرم ۱۰۷۶ھ میں انیس سال کی عمر میں عنانِ حکومت ہاتھ میں لی۔ درباری شاعر عبدالنبی نے

نوبتِ شاہی زدہ بعد محمد علی

سے تاریخ نکالی۔

علی عادل شاہ کا زمانۂ حکومت تمام تر لڑائی جھگڑوں میں بسر ہوا۔ ایک طرف مغلوں کے حملے ہو رہے تھے تو دوسری طرف سے مرہٹے پریشان کر رہے تھے اور پھر سلطنت کے امیر باغی ہو کر خودسر ہو گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود علی نے کامیاب حکومت کی اور تاریخ میں اپنا نام یادگار چھوڑ گیا۔

**وفات** ربیع الاول ۱۰۸۳ھ میں مظفر خاں بدنور کی مہم سے مظفر و منصور واپس آ رہا تھا۔ سلطان اپنے سپہ سالار کی سرفرازی کے لئے خود استقبال کو نکلا۔ بیجاپور کے قریب خدیجہ پور تک گیا تھا کہ راستہ میں سرد ہوا لگی، واپس آ کر بیہوش ہو گیا، دوسرے دن ہوش آیا۔ مگر نصف جسم پر فالج گرا۔ اس کی وجہ سے حس و حرکت موقوف ہو گئی۔ حکیم شمس الدین معالجہ کرتا رہا۔ مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ آخر ۳ شعبان ۱۰۸۳ھ کی صبح کو پانچ بجے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

قاضی نوراللہ، شاہ ابراہیم، علی محب، میر نعمت اللہ، ملک مسعود، ملک اکبر، میر رضا علی وغیرہ علماء وقت نے تجہیز و تکفین کی۔ شاہ پیٹ کے اسی برج میں جو خود سلطان تعمیر کر رہا تھا اور ہنوز نا تمام تھا دفن کیا گیا۔

**اخلاق و عادات** سلطان کے اخلاق و عادات کے متعلق بیجاپور کے مورخین نے بڑی تعریف کی ہے۔ سب کے سب اس کے عدل و انصاف

جود و سخاوت، رحم دلی اور منصف مزاجی، علم و فضل کے معترف ہیں۔ رعایا پروری، قدردانی، نوازی اور شرفا کی ہمت افزائی میں وہ اپنی آپ نظیر تھا۔

فنونِ لطیفہ کا بڑا ذوق تھا۔ شاعری موسیقی اور تعمیرات سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کی طبیعت رنگینی اور بذلہ سنجی پر بہت راغب تھی۔ رگ و پے میں عشق و محبت کی آگ سرایت کر گئی تھی۔

## سلطان کا ماحول

قبل اس کے کہ سلطان علی عادل شاہ کی شاعری کے متعلق کچھ لکھا جائے اولاً مختصر طور پر سلطان کے ماحول کی صراحت کی بھی ضرورت ہے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ سلطان کی شاعری پر اس کے ماحول کا کیا اثر ہوا۔

سلطان کی پرورش خدیجہ سلطان شہر بانو نے خاص اپنی نگرانی میں کی۔ خدیجہ سلطان گول کنڈہ کے محمد قطب شاہ کی لڑکی اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کی بہن تھی۔ سلطان محمد قلی جس کا اردو کلیات دستیاب ہو چکا ہے اس کا نانا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ سلطانہ کیسے علم دوست اور علم پرور باپ کی دختر تھی۔ گول کنڈہ کی فضا سلاطین قطب شاہی خصوصاً سلطان محمد قلی، سلطان محمد اور عبداللہ کے زمانہ میں جس طرح علمی اور ادبی ہو گئی تھی وہ تاریخ کے اوراق سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ان کے زمانے کے علمی کارنامے اور دکھنی شعراء کی زندہ یادگاریں دنیائے اردو میں جس طرح امتیازی درجہ رکھتی ہیں یہ اب پوشیدہ نہیں ہے۔ اس طرح خدیجہ سلطان کا ماحول شادی کے پہلے علمی اور ادبی رہا اور شادی کے بعد جب بیجاپور آئی تو یہاں ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کی پیدا کی ہوئی علمی فضا تھی، اور پھر سلطان محمد جیسا علم پرور بادشاہ اس کا شوہر بنا تھا۔ اس طرح یہاں بھی اس کی زندگی علم و فن کے ماحول میں بسر ہوئی۔ سلطانہ کی علمی سرپرستی خصوصاً شعراء اردو کے ساتھ مراعات اور حسنِ سلوک سے ہم بخوبی واقف ہیں جس کی تفصیل ہم نے "خیابانِ نسواں" میں کی ہے۔

سلطانہ کا صرف ایک علمی کارنامہ ہی جو اس کے حکم اور منشا اور اس کی سرپرستی سے ہوا یعنی رستمی کا خاور نامہ جو اردو زبان کی سب سے پہلی اور ضخیم رزمیہ مثنوی ہونے کے لحاظ سے مشہور و معروف ہے ایک ایسی اہم یادگار ہے جو سلطانہ کو زبانِ اردو کے محسنوں کی فہرست میں شامل کرنے کے لئے کافی ہے۔

سلطان علی نے جب اس علم دوست اور ادب نواز سلطانہ کے دامنِ عافیت میں پرورش پائی تو واضح ہو سکتا ہے کہ اس کا بچپن کس طرح علمی اور ادبی فضا میں نشو و نما پایا ہوگا۔

سلطان کی تعلیم جن علما کی صحبت میں ہوئی اُن میں سے اکثر ایسے تھے جن کو اردو زبان کا کافی ذوق تھا، اور وہ اپنے وقت کے زبردست شاعر تھے، اور پھر سلطانہ خدیجہ کے درباری شعرا رستمی ملک خوشنود وغیرہ کی مصاحبت بھی ذوقِ سخن سنجی پیدا کرنے کے لئے کافی سے زیادہ سامان رکھتی تھی۔

اس شہزادگی کے زمانہ کے بعد سلطان جب صرف انیس سال کے سن میں تخت و تاج کا مالک بنا تو نہ صرف اپنی سلطنت کو دشمنوں سے گھرا پایا بلکہ امرا میں بھی بغض و حسد کی آگ شعلہ زن دیکھی۔ ایک طرف مغل تاک لگائے بیٹھے تھے دوسری طرف سیواجی ہاتھ پیر نکال رہا تھا۔ صلابت خاں اور اس کے رفقا آمادۂ فساد تھے۔ اس طرح شروع سے آخر تک اُس کی زندگی میدانِ جدال و قتال میں بسر ہوئی۔ تیغ و تفنگ تیر و نیزہ۔ توپ و گولہ کا تماشہ ہر وقت نظر آتا رہا۔ آج بیجاپور میں بسر ہوئی تو کل مغلوں سے جنگ، ادھر مرہٹوں سے مقابلہ تو دوسری طرف صلابت خاں کا ہنگامہ گرم رہا۔ غرض اس کی سولہ سالہ حکومت میں بہت کم اس کو امن اور چین کا زمانہ نصیب ہوا۔

سلطان کے زمانہ میں عادل شاہی حکومت کو قائم ہوئے ایک صدی کا

عرصہ ہو چکا تھا۔ شیرازۂ سلطنت درہم برہم ہونے لگا تھا۔ بیجاپور کی عام معاشرت میں سادہ زندگی، بلند مشربی اور عالی دماغی کا وجود نابود ہونے لگا تھا۔ تمدن اور معاشرت کے انتہائی منازل طے ہو چکے تھے۔ عالی شان قصروں کی زیبائش اور آراستگی میں سونے کو پانی کی طرح بہایا جانے لگا تھا۔ جنت نظیر باغ، فردوس منظر گلزار اور رشکِ ارم خیابانوں کی چمن بندی اور گلشن آرائی میں بے دریغ روپیہ صرف ہو رہا تھا۔

بزمِ عیش وطرب گرم رہا کرتی، موسیقی اور رقص وسرود کے جلسے ہوتے تھے۔ ساقیانِ مہ وش، نازنینانِ گلبدن، اور زاہد فریب رانیاں زینتِ محفل ہو کر صحبت کو گرماتی تھیں۔ ان ماہ جبینوں کی جلوہ آرائی ان کے معطر لباسوں، نیم برہنہ جسموں اور قیمتی جواہرات کی ضیاپاشی سے محفل کا سماں دوبالا ہو جاتا اور ساغر کے دور مے گلگوں کے سرور سے طبیعتیں مسرور و مدہوش رہا کرتیں یہ تھا وہ ماحول جس میں سلطان علی عادل شاہ نے آنکھ کھولی اور پھر پینتیس سال کے بعد ہمیشہ کے لئے بند کر لی۔

ان تمام امور کا اثر اس کی شاعری پر پڑا اور اُس کی شاعری اپنے ماحول کا صحیح اندازہ پیش کرتی ہے۔

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ شہزادے کی مصاحبت میں متعدد شعرا تھے، اور اس کا ماحول بھی شاعرانہ تھا۔ اس کا اقتضا تھا کہ سلطان نے اپنی شہزادگی میں عنفوانِ شباب ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور اپنا تخلص شاہی قرار دیا تھا۔ اور نہ صرف خود شعر کہتا بلکہ اپنے دیگر مصاحبین اور ملازمین کو بھی شعر کہنے پر مجبور کرتا تھا۔ اس عہد کے ایک مورّخ قاضی نوراللہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان پُرگو شاعر تھا اور اس کے کلام کو جمع کرنے کے لئے شاہ ابوالمعالی متعین تھا۔

جس کو وہ ایک کتاب میں جمع کرتا جاتا تھا۔

جس طرح قاضی نوراللہ نے سلطان کے کلام کی تعریف کی ہے اسی طرح اُس وقت کے ملک الشعراء نصرتی نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ سلطان کی تعریف میں کہتا ہے۔

سخن سنج کامل ہنرور توہی ‏ ‏ زباں آوراں کا بھی داور توہی
ترے شعر نے سب سے شعراں کا نور ‏ ‏ مضامین معانی کے گردوں کیے
ترا ذہن نرمل تری طبع صاف ‏ ‏ سخن سنج و باریک بیں موشگاف

نصرتی اپنے قصائد میں بار بار کہتا ہے ترا لقب "استاد عالم" مشہور ہو گیا ہے اور اس کی استادگی کا معترف ہے۔

تجہ استادگی جگ پہ ثابت کری
دلیل آج تیری ہنر پروری

نصرتی نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان نے خاص خاص مصاحبوں کو منتخب کر کے ان کی طبیعتوں اور ذوق کے مطابق ان کی تربیت کی تھی اور اس کے تربیت کردہ شاعروں نے ایک خاص اسلوب میں شاعری شروع کی تھی۔ خود نصرتی بھی سلطان ہی کا تربیت یافتہ تھا۔ چنانچہ خود اس نے اس امر کا اعتراف کیا ہے۔

مجھ استاد استاد عالم اچھے
جتا علم از بر جیسے جسم اچھے

یہ ہم کو معلوم ہے کہ دکن میں اردو شاعری کی ابتدا پر اس سلطان کے زمانہ میں دو صدی گزر چکے تھے اور اس کے ابتدائی مراحل طے ہو کر اصناف سخن کی بنیاد قائم ہو چکی تھی۔ مثنوی، قصیدہ، غزل، رباعی اور مرثئے لکھے جاتے تھے۔ سلطان کے کلام میں ہم کو مثنویاں، قصیدے، غزلیں اور رباعیاں سب کچھ ملتے ہیں۔ اب ہم

سلطان کے کلام پر کسی قدر تفصیل سے نظر ڈالتے ہیں۔

**مثنوی**

دکن کی ابتدائی شاعری میں ہم کو مثنوی کا ذخیرہ زیادہ دستیاب ہوتا ہے۔ بیجاپور اور گول کنڈہ کا کوئی شاعر ایسا نہیں تھا جس نے ایک یا ایک سے زیادہ مثنویاں نہ لکھی ہوں۔ یہ مثنویاں کئی کئی ہزار اشعار کی بھی ہوتی تھیں۔ گول کنڈہ کی مثنویوں میں وجہی کی قطب مشتری۔ غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ، ابن نشاطی کی پھول بن طبعی کا قصہ۔ بہرام و گل اندام، غلام علی کا قصہ پدماوت، لطیف کا ظفر نامہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح بیجاپور کی مثنویوں میں مقیمی کی چندر بدن و مہیار، ملک خوشنود کی ہشت بہشت، رستمی کا خاور نامہ صنعتی کا قصہ تمیم انصاری، ہاشمی کی یوسف زلیخا اور نصرتی کا علی نامہ اور گلشن عشق لائق اظہار ہیں۔

دکھنی شعراء کی اس خصوصیت کے موافق سلطان علی عادل شاہ نے بھی ایک طویل مثنوی بدیع الجمال کے نام سے مرتب کی تھی۔ اس کا ایک نامکمل نسخہ ہماری نظر سے گزرا ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں۔

خدایا تو شاہی کے ایمان کوں　　توی رکھ نبی آل کے دین سوں

اپنی تعریف میں کہتا ہے۔

سخاوت ہوا شاہ کا جب ظہور　　ہوا نام حاتم کا جگ میں سوں دور

کیا شاد جگ کوں علی دادگر　　رکھیا عدل سوں ملک آباد کر

سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد کے کلیات میں بھی سلطان کی تین مثنویاں ہیں۔ ایک مثنوی ۷۴ شعر کی ہے جس کو خیبر نامہ سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس میں جنگ خیبر کے حالات نظم کئے گئے ہیں۔ واقعات صداقت کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ مبالغہ اور دروغ گوئی کو اس میں دخل نہیں ہے۔ یہ مثنوی واقعہ نگاری کا اچھا نمونہ ہے۔

اوّل حمد و نعت، پھر منقبت پھر اصل واقعات کا اظہار ہوا ہے، دوسری دونوں مثنویاں سات سات شعر کی ہیں۔

خیبر نامہ کے بعض اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

اوّل حق کی توحید سوں کر سخن!
تجھن خوش ادا سوں بیاں کر بچن

تجھے ہے سزاوار حمد و ثنا
ترے حکم سوں ہے نہنا ہور بڑا

اناایک قصہ سنو جنگ کا
کہ وہ جنگ تھا دین کے ننگ کا

اتھا ایک خیبر کا قلعہ نگل
بڑے بہر کلاں پر اکل تھے اتل

پتھر تھے برج کے بچرے کھڑے
اتھے سخت وہ سب نہنے ہور بڑے

سلح ظاہری باطنی سوں سنوار
عنایت کئے شاہ کوں ذوالفقار

روانہ ہوئے جنگ کوں نامدار
وہ شاہِ ولایت ادھک کامگار

چلے شہ وہیں کفر کوں توڑنے
او جا سٹ پتھر کے بتاں پھوڑنے

یہودی جتے تھے ہوئے سرنگوں
غنیمت لگی ہاتھ حد سوں فزوں

فتح کر قلعے کوں شہنشاہِ نور
پھرے لے کے لشکر پیمبر حضور

ترا یاد دن رات شاہی کا کاج
ترے فیض سوں ہے اسے تخت و تاج

**قصائد** دکھنی شعراء نے قصائد بھی کہے ہیں۔ اُن کو اس لئے اس کی خاص ضرورت ہوتی تھی کہ ان میں سے اکثر کو بادشاہ کا تقرّب حاصل رہا کرتا تھا، دربار اور جشنوں میں شریک ہونا پڑتا۔ رزم اور بزم میں وہ بادشاہ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ اس طرح ان کو ہر موقع پر بادشاہ کی مدح اور ستائش کا موقع ملتا تھا۔ دکھنی مثنویوں میں عموماً حمد و نعت منقبت کے بعد بادشاہ کی مدح کا عنوان ضرور ہوتا تھا۔ تاریخوں سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ شعراء نے اکثر موقعوں پر قصائد

پیش کیے ہیں۔ مگر افسوس ہم کو اس وقت تک سوا نصرتی اور سلطان محمد قلی اور غواصی کے قصائد کے دوسرے قدیم دکھنی شعراء کے قصائد نہیں ملے ہیں۔

خوش قسمتی سے سلطان علی عادل کے کلیات میں اس کے چھ قصیدے بھی شامل ہیں۔ پہلا قصیدہ حمد میں ہے۔ دوسرا نعت میں۔ اس کے پچاس شعر ہیں۔ تیسرا قصیدہ حضرت علیؓ کی مدح میں ہے اس کے پچاس شعر ہیں۔ چوتھا قصیدہ دوازدہ امام کی منقبت میں ہے اس کے ۶۵ شعر ہیں۔ پانچواں قصیدہ علی داد محل اس کے باغ اور حوض کی تعریف میں ہے۔ اس کے بھی ۶۵ شعر ہیں۔ چھٹا قصیدہ چہار در چہار کے عنوان سے ہے۔ اس کے ۱۹ شعر ہیں۔

ان قصائد سے شاہانہ طمطراق اور تخیل کی بلند پروازی صاف طور سے نظر آتی ہے۔ قصائد کے بعض شعر ملاحظہ ہوں۔

حمد کے قصیدے میں عقل کی تعریف میں کہتا ہے۔

عقل کا مکتب ہوا فہم کے پڑھنے بدل — عقل معلّم اپن قصّہ سکھایا کہن
عقل خبردار ہے عقل ہمہ کار ہے — عقل کا جاسوس ہو نکہ پہ اچھے یو کرن
عقل کا موتی مگر مغز کے طبلے بہتر — خوب دسالدے جھلک دے جگ درعدن

اس کے بعد

خاک کی پتلی بنا روح بے تن میں بھرا — جال چلا کرا دل آپ سکھایا مکن
آب و آتش ملا خاک و ہوا تے کلا — چار عناصر لگا دیہ سنوایا ہمن
دور بھیریں جو تمام سجدہ کریں صبح و شام — لیکہ ستاریاں سنگات چاند سورج ہور گگن
نور کا جھلکاٹ دے حور پری لک سنوار — سات طبق سرک کے پور رکھیا ذوالمنن

خاتمہ

شاہی عاشق اتا بول مناجات کیچ — تاکہ کرم تج پہ ہوئے بہر حسینؓ و حسنؓ

کاہ جہاں کے سگل فکر تے بہاری اچھے — سائیں کرے لوبھ جب دورہو جائے من
آہ و افسوس کے قبح تے محفوظ د ہد — سایہ کرم کا دکھا ذوق سوں رکھ مج بدن
سائیں سچا ہے تہمن سیوا تجے ہے سبھی — جیتے جہاں کے شہاں ذکر یں تج سخن
حضرت علیؓ کی منقبت کا قصیدہ ساقی نامہ سے شروع ہوتا ہے۔
ارے کلال مجکوں پیالا پلا میا کا — تا مست ہو کے دیکھوں مکھڑا علی پیا کا
گریز
شاہ نجف ولی ہے تس ناوں سو علی ہے — وہ ازدواں احمد سلطان اولیا کا
دوازدہ امام کی منقبت والے قصیدے میں حضرت امام حسینؓ کی شجاعت کا ذکر یوں کرتا ہے۔

سارے جہاں میں نہیں ہوا تج سار کا شمشیر زن
جس پر کیا یک وار توں دو دھر برابر ہو پڑے

باغ علی داد محل کا قصیدہ بڑا زبردست قصیدہ ہے اور سنگلاخ بحر میں کہا گیا ہے۔

ابتدا حسب ذیل اشعار سے ہوئی ہے۔

دسے مج نین میں اس حوض پہ چندنا یو جھل
دہریا ہے چاندنی جیوں نیکہ اپس مکہ کے اکل
صفائی دیکھ کر اس حوض کی چندر دائم
چلے آکاس پہ رات شوق سوں امرت نے ادبل
پریاں اچرج ہو کھیاں دیکھ کر اس حوض کتیں
اچھے امرت تے بہریا حوض یو سمندر تے ڈکل

علی واد محل کا ذکر۔

بسوایا اٹھواں سمندر پھر یا جب نیر سول حق
سزاوار اس کے آئیں گگ ہے یوں ہی داد خل
پایا اچھے اس قصر کا پاتال تلک
طاق کسریٰ ہوئے معراج اسے زہ کے اگلا

خاتمہ

دکھانے طبع کی قوت شاہی اس بحر منے
بند جیا ہر بیت میں کئی لفظ یوں صنعت کے نول
جان ہور دل تے اجابات دعا منگتا ہے
تا اچھے امن میں سکھ چین نے یو نت سگل
جو لگوں رات دن دو پہر گھڑی جشن منے
بجا انند سوں اس گھر میں سدا تال مثل

غزلیں

شمالی ہند کے شعرا نے زیادہ تر غزلوں میں طبع آزمائی کی ہے اور ان کے دیوان غزلوں سے پُر نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف ابتدائی دکھنی شعرا صنعت غزل میں بہت کم طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ وہ اپنا کمال غیر مسلسل نظم کے بجائے مسلسل نظموں میں ظاہر کرنے کے عادی تھے۔ مگر ان کے دیوانوں میں ہم کو غزلیں بھی ملتی ہیں۔ سلطان قلی کے دیوان میں بیسیوں غزلیں ہیں۔ اسی طرح علی عادل شاہ کے کلیات میں بھی اٹھارہ غزل ہیں جو مختلف بحروں میں کہی گئی ہیں۔

غزل معشوق سے راز و نیاز اور اس کے غمزہ و عشوہ کے اظہار کا دوسرا نام ہے۔ اس کی خوبی، رنگینی اور تخیل کی پرواز عاشقانہ مضمون آفرینی ہے۔ سلطان کے کلام سے بھی انہی امور کی کافی وضاحت ہوتی ہے

بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

جس دن تے تمن سات لگیا من را ہمارا        اس دن تے پرت کا ہوا مج تو بہر پیارا

---

ابرو کماناں کھچ کر مارے پلک کے تیر سوں        زخمی ہوا دل کا ہرن لاگیا نشان تج ہاتھ کا

---

جس زلف و گال کے آگیں شام و سحر کو ہو        تس روپ کے پرکھنے کوں صاحب شعور کو ہو

---

مرجان میں صافی نہیں یاقوت میں صافی اچھے        جس فرات میں صافی اچھے اس فرات کوں نظر کہو
یاقوت ہور مرجان کی شاہی لکھیا ساری غزل        سن کر جگت کے شاعراں اس شعر کوں افسر کہو

---

مظفر علی شاہ کے ہات کا        اُچک تیر لاگیا نشانی کے پگ

---

تج نین کی نرمی کنے منگتے ہیں موتی آبرو        یا روپ کی تو کان ہے یا حسن کی سمدر ہے

---

تج گال پر نگ کا نشاں دستا ہے مج اس ہانتھ کا
روشن شفق میں جگمگے جیوں چاند پہلی رات کا

---

ساری رین تیرا ملن مج طبع میں بھر پور ہے        تج صبح مکہ کے سامنے دیکھ سب سد المحفوظ ہے

---

تج زلف مشکیں دیکھ کر سانپاں تجے اپناں سب
تج لب کے رے لالی آنگے لعلاں سنے لاکا ست کا

---

ہوئی ہے تال عالم میں تمھارے چال سوں اکثر
لٹک چلنا تمن جیسا کسی منکل نہیں دیکھا

---

رنگلے رنگ بھرے شاہی لگائے ہم کا لاوک
جس کا تورین ساری مچ نہیں رنگ میں الکاتے ہیں

---

**ریختی** ریختی عام طور سے اس غزل کو کہا جاتا ہے جو عورتوں کی زبان میں ہوتی ہے۔ انشا اور رنگین اور جان صاحب نے اس صنفِ شاعری کی ایسی مٹی پلید کی اور اُس کو ایسا بدنام کر دیا کہ ریختی فحش کے مرادف ہو گئی۔ حالانکہ ابتداءً ایسا نہیں تھا۔ اس صنف کا موجد ہاشمی بیجاپوری متصور ہوتا ہے، جو اسی سلطان کے عہد میں موجود تھا۔ مگر اس امر کا خیال رہے کہ اس زمانے میں اس قسم کی غزل کا کوئی خاص نام نہیں تھا۔

معلوم ہوتا ہے اپنے عہد کے شاعر ہاشمی کی سلطان نے بھی پیروی کی اور اس زبان میں طبع آزمائی کی ہے۔ ایک غزل اس کے کلیات میں موجود ہے۔ اس کے بعض شعر ملاحظہ ہوں۔

نج نین کے نگر میں لالن وطن کئے جب
تب انجمن کے لوگاں خلوت اسے کہتے ہیں

ملیں پیچ کود ہو پیا سنگ لاگ کے رہی ہو دائم
یک تل جدا نہ ہونا وصلت اسے کہتے ہیں

کاں ہور گلاب میانے نہیں کچ فرق ازل تے
یوں پیو سوں مل رہی ہوں الفت اسے کہتے ہیں

روں روں رسن کری میں شاہی کا نون لئے
پھر پھر نہ ڈالوں لینا راحت اسے کہتے ہیں

---

**ریختہ** شمالی ہند میں ایک زمانہ دراز تک اردو زبان کا نام ہی ریختہ تھا اور اُردو نظم کو بھی ریختہ سے موسوم کرتے تھے۔ مگر دکن میں ایسا نہیں تھا۔ بلکہ ریختہ صرف وہ نظم کہلاتی تھی جس میں مصرعے فارسی اور دکھنی ترکیبوں سے مرکب ہوتے تھے۔ چنانچہ سعدی دکھنی کہتا ہے۔

سعدی غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ
در ریختہ در ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

سلطان کے کلام میں بھی اس قسم کا عنصر موجود ہے، اور کلیات میں اس کو ریختہ کے عنوان سے درج کیا گیا ہے بعض شعر ملاحظہ ہوں۔

دیدم نظر بہر دیپ جو اس شوخ چکہ مستانہ را ۔۔۔ گفتم بیا مندر منے روشن بکن کاشانہ را
ناماں کر اس بول کوں انچل جھٹک کے جب چلی ۔۔۔ آغشتم سون بولی مجھے با من مگو افسانہ را
تس کے فراقوں یوں دسے گلزار سب انگار ہو ۔۔۔ یو دل معلّم ہو مرا دیوے سبق پروانہ را
موزوں متقفا بولنے ہر یک کو کاں طاقت اچھے ۔۔۔ اچرج کھیا شاہی غزل سنے بدل پڑانہ را

---

**رُباعی** دکھنی شاعری میں رباعی کا بھی خاص درجہ ہے جس طرح دکھنی مثنویاں مشہور و معروف ہیں اسی طرح رباعی میں بھی دکن کو امتیاز حاصل ہے۔ قدیم شعراء کے قطع نظر آج حضرت مرحوم امجد اقلیم رباعی کے بادشاہ قرار دیئے جاسکتے تھے جن کی ہر ایک رباعی زبانِ اُردو کا گراں بہا خزانہ ہوتی ہے۔

سلطان علی عادل شاہ کے کلیات میں ہم کو ایک رباعی ملتی ہے جو حسب ذیل ہے۔

سب دیس گیا ہے دھن نے لڑتے لڑتے ۔۔۔ کھٹ رات گئی ہے پاؤں پڑتے پڑتے
کیا نیکہ مدن کا او بخ لگتا ہے مجھے ۔۔۔ رہے پانوں سرے پیت کے چڑتے چڑتے

---

**دیگر اصناف** سلطان کے کلیات میں مخمس اور مثمن بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں اس صنف میں بھی طبع آزمائی ہوتی تھی۔ سلطان کا مخمس بہت زبردست ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں۔

پیو مورت دیکھوں سپنے میں،
جب جاگوں تب رہوں تپنے میں
لا دیپک برہا اپنے میں!
تن جالے جھجک جھجک جپنے میں
آرام اچھے مج کھپنے میں
کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات ۔۔۔ میں نہ بندی تو کیتا گھات

تج یاد کر تل ملتی ہوں
لہو تیل منے دل تلتی ہوں
تن موم بتی ہو جلتی ہوں
اس جلنے سوں نا ملتی ہوں
سب رین برہ میں گلتی ہوں
کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات ۔۔۔ میں نہ بندی تو کیتا گھات

جو برہا جالیا تن کوں اب
یو دو کہ گیہر آ گیر یا تب
جیو ہنو نت جالیا لنکا سب
اب کے سین سوں سوں بولوں
ہیں مکھڑا دیکھوں پیو کا کب
کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات ۔۔۔ میں نہ بندی تو کیتا گھات

سلطان نے پہلیاں بھی کہے ہیں راگنیاں بھی ہیں۔ تاریخیں بھی ہیں۔ بخوف طوالت ان کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔

"تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان نے مرثیے بھی کہے تھے اور خود اس کُلیات میں مرثیے کا عنوان ہے۔ مگر افسوس اس میں کچھ مرثیے نہیں ہیں۔ اس لئے ہم سلطان کے مرثیے پیش نہیں کر سکتے"۔

ہم سلطان کا کلام پیش کر چکے ہیں مختلف اصنافِ سخن کا نمونہ نظر سے

**تبصرہ** گزر چکا ہے جس سے سلطان کی قوتِ بیان اور زورِ کلام کا بخوبی پتہ چل سکتا ہے۔ زبان پر اس کو جو قدرت تھی اس کا بھی صاف صاف اظہار ہوتا ہے اس کے قصیدے جہاں ادق اور سنگلاخ زمین میں ہیں وہاں آسان اور سہل بھی ہیں۔ اُن سے شاہانہ طمطراق اور رعب داب کا کافی اظہار ہوتا ہے مثنویوں سے واقعہ نویسی اور مرقع نگاری کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے۔ اُس کی غزلیں رنگین خیالی، عاشقانہ مضمون آفرینی اور تخیل کی پرواز کو بخوبی ظاہر کرتی ہیں۔ اس کی تشبیہیں اور استعارے سادہ ہیں۔ اس کے کلام میں مبالغہ کی چاشنی بہت کم ہے۔ اس کے اور آج کل کے عاشقانہ کلام میں سوا زبان کی صفائی اور تخیل کی پرواز کے اور کچھ فرق نہیں ہے۔

معشوق کی وہی زلفِ سیاہ، رخسارِ گلگوں اور چشمِ فتاں کی تعریف ہے۔ اس کی ترچھی نگاہ سے عاشق کا گھائل ہونا اور تیرِ نظر سے اس کا دل و جگرہ ہونا سب وہی ہے۔ معشوق کے جدائی کا صدمہ اس سے سہا نہیں جاتا۔ زمانہ فراق میں رات کو نیند آتی ہے اور نہ دن کو چین نصیب ہوتا ہے۔ کوئی اس کا پرسان حال نہیں۔ موتی کی طرح اس کے آنسوں نکلتے ہیں۔ جدائی میں ایک ایک پل سال معلوم ہوتا ہے۔

سلطان کے زمانہ میں دکھنی شاعری کی ابتدا ہو کر چونکہ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اس لئے سادگی اور عام فہمی اس زمانہ میں کلام کے عام خصوصیات تھے۔ لامحالہ سلطان کا کلام بھی انہی عناصر سے مرکب ہے۔

بہرحال سلطان علی عادل شاہ اپنے زمانے کا ایک زبردست اور بلند پایہ شاعر تھا جس طرح اس کا زمانۂ حکومت لڑائی اور جنگوں کے لئے یادگار رہے اُسی طرح اردو ادب کی ترقی اور شاعری کے گھر گھر چرچے اور جابجا مشاعروں کے لحاظ سے بھی یادگار ہے۔

(شہاب سنہ ۱۹۳۴ء)

# سلطان عبداللہ قطب شاہ کی اُردو شاعری

گولکنڈہ کے قطب شاہی سلاطین کا ساتواں حکمراں سلطان عبداللہ قطب شاہ جس نے ۱۰۳۵ھ سے ۱۰۸۳ھ تک حکمرانی کی ہے، اپنے پیش رو سلاطین کی طرح ایک علم دوست اور شعر وسخن کا سرپرست بادشاہ تھا۔ اس کی اکثر باتیں اس کے نانا سلطان محمد قلی قطب شاہ سے ملتی ہیں۔ وہ ایک طرف اربابِ علم وفن، شعرا اور ادیبوں کا قدر دان تھا تو دوسری طرف موسیقی، رقص وسرود، طرب ونشاط سے بھی دلبستگی تھی۔ نامی گرامی علماء وفضلاء، بلند پایہ شعراء اور ادیب اس کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ علامہ نظام الدین نے "حدیقۃ السلاطین" جیسی تاریخ اس کے عہد میں لکھی مشہور فارسی لغت "برہانِ قاطع" اس زمانہ کی تالیف اور سلطان کے نام سے منسوب ہے شمس الدین محمد المعروف علامہ ابن خاتون نے کتاب الارشاد" اور "جامع عباسی" پر حواشی لکھے۔ ملّا جمال الدین نے "کتاب المصباح" کا اور ملّا علی ابن طیفور نے "عیون اخبار رضا" کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ مولانا حسین آملی نے "نہج البلاغۃ" کی شرح لکھی۔ ملّا فتح اللہ سمنانی نے امام یافعی کی کتاب "روضۃ الریاحین" کا ترجمہ کیا۔

علامہ فہامی میر مجد الدین جو علامہ میر محمد مومن استرآبادی کے فرزند تھے فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے میر سیّد محمد اسفرائنی اور ملا خلقی رونقی، قیصری زبردست شعراء تھے۔ عمدۃ الفضلاء قاضی احسن، سیادت پناہ قاضی ظہیر الدین، حکیم عبد الجبار گیلانی، شیخ عبد اللطیف، نور اللہ صدر مدرسہ دار الشفاء، مرزا محمد جوہر تبریزی، مرزا محمد مشہدی، قاضی عطار اللہ گیلانی وغیرہ سلطان عبد اللہ کے عہد کے مشاہیر علماء ہیں۔

سلطان کے زمانہ میں اعلیٰ حلقوں میں شعر و سخن کا جو چرچا بندھ گیا تھا، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ رات رات بھر بادشاہ کی موجودگی میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ سہ شنبہ کے دن جو عام تعطیل کا دن تھا، بادشاہ کا مشغلہ صرف یہ ہوتا کہ شعر و سخن سے لطف اندوز ہو اور قدماء کے کلام پر نقد و تبصرہ عمل میں آئے۔

اس ماحول میں دکھنی (قدیم اردو) ادب کا بول بھی بالا سے بالاتر ہو گیا۔ وجہی، غواصی، سلطان، ابن نشاطی، جنیدی وغیرہ نے اپنے دماغی تخیل کو پرواز دے کر زبان کی سلاست اور اسلوب کی روانی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

ایک طرف مجالسِ میلاد، مجالسِ عزا کا زور تھا۔ بلا تفریق مذہب و ملت ادنیٰ و اعلیٰ ان مجالس میں شریک ہوتے تھے۔ اور بادشاہ کی شرکت سے ان مجالس کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ محفلِ میلاد میں قصائد اور مجالسِ عزا میں مرثیے دکھنی زبان میں سنائے جاتے تھے۔ دوسری طرف بزم عیش و نشاط آراستہ ہوتیں۔ دور دور سے اربابِ موسیقی گولکنڈہ میں جمع ہو گئے تھے، جو سلطان عبد اللہ کی قدر دانی اور سرپرستی سے نہال ہوتے۔

اس ماحول میں خود بادشاہ کا بھی سخن گوئی کا شوق پیدا ہونا لازمی تھا۔ شاعری اس کے باپ دادا کی میراث تھی۔ غواصی دربار کا ملک الشعراء تھا۔ سلطان عبد اللہ فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں شاعری کرتا تھا۔ اس کا تخلص عبد اللہ تھا۔

سلطان کا دکھنی کلام مختلف جگہ سے دستیاب ہوا ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) کتب خانہ نواب سالار جنگ (۲) تذکرہ شعرائے دکن مؤلف عبد الجبار خاں

(۳) بیاض مملوکہ محمد نصیر الدین خاں صاحب مرحوم سابق ناظم ریکارڈ آفس حیدرآباد

(۴) بیاض مملوکہ ورثاء مولوی صفی الدین صاحب مرحوم۔

نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں جو دیوان موجود ہے اس کو "مجلس اردو مخطوطات" حیدرآباد نے طبع کرا دیا ہے۔ دیوان نامکمل ہے۔ کیونکہ اس میں صرف ردیف 'ث' تک غزلیں ہیں۔ بعض غزلیں مسلسل ہیں ان کو نظم کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ کل تعداد ۹۷ ہے۔ اس میں ردیف الف کی ۷۷ غزلیں۔ حرف 'ب' کی ۹ 'ت' کی ۷ اور 'ث' کی ۴ غزلیں ہیں۔

عبد الجبار خاں نے جو نمونۂ کلام اپنے تذکرے میں دیا ہے وہ سالار جنگ کے مملوکہ نسخہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس دیوان کے کلام کو تقسیم کیا جائے تو حسب ذیل عنوان ہو سکتے ہیں۔ حمد، نعت، منقبت حضرت علی۔ عید مولد نبی، عید غدیر، عید رمضان، بسنت، مرگ، نوروز، اس کے علاوہ تغزل بھی ہے اور تصوف بھی۔ سلطان عبداللہ کے کلام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے مقطع میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت علی کا اسم گرامی ضرور لاتا ہے۔

اب ہم عنوان مذکورۂ بالا کے لحاظ سے سلطان عبداللہ کا کلام بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

**حمد**

سلطان عبداللہ کے دیوان میں اولاً حمد کی غزلیں ہیں۔ ایک غزل حسب ذیل ہے۔

ولا حق کی طرف ہو کہ حق آرام دوے گا (دیوے)　　سعادت کی تمے ہات (ہاتھ) سرانجام دوے گا

اگر تیری نظر کام اپر ہے تو صد اصدق
آسوں لاکر اسے یاد کرو دے آرام دوے گا

اوپر — آنسوں — وہ

نہ دل گیر ہو دنیا تھے کہ ہر وضع سچ آخر
فلک غیب تھے آنند کے پیغام دوے گا

سے — تجھ کو — سے راحت

عجب کیا جو کرے جوش یو مستی دو جہاں میں
منجے ساقی اگر یو سچ بھرے جام دوے گا

یہ — مجھ کو — یونہی

رکھوں پانو ستاریاں کے سر اپراں کرو فخر
اگر ذوق منجے وصل دل آرام دوے گا

اوپر

بغیر عشق نہ گم سوں کہ گھڑی شہر گیا ہوں
گزار سکوں
جتا مال ملک منج کوں او انعام دوے گا

جتنا — مجھ کو

نبی صدقے مے توں نام لے عبداللہ علی کا
کہ منج فتح و ظفر تج کوں وہی نام دوے گا

---

سلطان عبداللہ قطب شاہ نے نعت میں کئی غزلیں موزوں کی ہیں ایک

**نعت** غزل یہاں پیش کی جاتی ہے۔

خدا پیغمبری دے کر محمد کو جو سرجایا
فلک کل بر زمیں آیا جگ ایماں اس پر لیایا

پیدا کیا — لایا

ملک اس کا ج دم ماریں ستارے آپ سیں واریں
نہ کئی اس پوچھنے ہاریں کہ وو اوتار ہو آیا

اس کا ہی — اپنے آپ — کوئی — وہ

دسیں معجز عجب اس کے نہاں ذرے ہیں سب اس کے
دیا ہے بات رب اس کے دنیا ہور دین کا پایا

دکھائی دیتی — اور — مرتبہ

جلائے جیو کو اس کا ناؤں بل ہیں نت اس پر جو
کہ کئی بیعوے زمیں پر چھا تو اس کے قد کی نئیں پایا

جی — نام صدقہ — ہمیشہ — نہیں

لٹکتا وو جد ھر جاوے بدل چھتر ہو سر چھاوے — نہ کمھ دھو، اس کوں دکھلاوے ہے اس کا سب اپر سایا

وہ بادل اس کو

کثافت کفر کا دھوسٹ کیا کافروں کو چیٹ — تو باقی ہو آچا یا کھٹ خوش اپنے وین کا پایا

دور کرکے نابود بلند کیا

میں عبداللہ ہوں داس اس کا دھروں دو جگ میں آس اس کا

غلام رکھوں

بھنور ہوں لیوں باس اس کا محمد ہو منج بھایا

بھنورا لوں خوشبو پسند آیا

---

**منقبت حضرت علیؓ** قطب شاہی سلاطین شیعہ مذہب کے پیرو تھے، حضرت علیؓ کی مدح اور ستائش اپنی زندگی کا سرمایہ خیال کرتے تھے۔ اپنے نانا سلطان محمد قلی کی طرح اس نے بھی منقبت حضرت علی میں کئی غزلیں موزوں کی ہیں۔ ایک یہاں درج کی جاتی ہے۔

علی شیرِ حق شاہِ دلدل سوارا — کھندل کفر کے ڈل بھجن کرن ہارا

روند ڈالا لشکر

چھٹے تھر تھری باد اگن خاک جل کوں — کھڑا ہووے جب ہات لے ذوالفقارا

طاری ہوئی رعشہ ہوا آگ پانی ہاتھ

یکند دھنور رنگ منڈل انبر کا — دسے اس کے دلدل کے سم کا دھلارا

سراسر گھنگور بادل آسمان دکھادے گرد و غبار

کیا فرش آپس چاند پاداں تل اس کے — لیا عرش کھاندے پر اس کا پھرارا

اپنے آپ کو نیچے کندھے

فدانا تو پر اس کے تل تل کوں ہوئے　　خدا کا جو عالم ہے ہژ دہ ھزارا

ہر وقت

جکیچ راز پردے منے غیب کے ہیں　　سو مخفی نہیں اس پہ ہے آشکارا

جو کچھ

نبیؐ صدقے اے عبد اللہ دم علیؑ کا

مرے دم سوں ہمدم ہو رھیا ہے سارا

ہو رہا ہے

**عید مولود نبیؐ** قطب شاہوں میں عید مولو نبیؐ بڑی شان و شوکت سے منائی جاتی تھی۔ "داد محل" کے میدان میں محفل ہوتی تھی۔ عید میلاد النبیؐ کے آمد سے بہت پہلے صناع، ہنرمند اور استادانِ صنعت و حرفت اس مقام کے سامنے اپنے عجیب و غریب کمالات کی پیش کشی میں مشغول ہو جاتے اور جب روز مولود النبیؐ (۱۲۔ ربیع الاول) آجاتی تو کوسوں، دماموں، نقاروں، نفیریوں، اور قرناؤں کی آواز سے میدان داد محل گونج اٹھتا، تمام شہر اور اطراف کے لوگ اس میدان میں جمع ہوتے اور صنعت و حرفت کے کرشموں کا تماشا دیکھتے، اور ان دو دل کشا قصروں کی تصویروں کی سیر کرتے۔ ان دونوں قصروں کا دیواروں پر تصویریں اتاری گئی تھیں۔ عید مولو دنبی میں عوام ان تمام تصویروں کو دیکھنے جمع ہوتے تھے اور عوام کو عام طور سے دیکھنے کی اجازت دی جاتی تھی۔

ان مصوّر منقوش ایوانوں کے سامنے کے میدان میں اس تقریب سعید کے لئے ایک بہت بڑا خیمہ کھڑا کیا جاتا۔ اس کے وسط میں ایک شامیانہ باندھا جاتا جس میں شاہی تخت رکھا جاتا تھا جو تمام و کمال سونے کا تھا اور قیمتی جواہرات سے مرصع تھی، اس کے اطراف شاہی تجمل و لوازم کے مناسب آراستگی کی جاتی۔ ماہرینِ فن موسیقی

جمع ہو جاتے اور اپنے فنِ موسیقی اور رقص کے کمال دکھاتے۔ اہلِ موسیقی کے علاوہ دوسرے صاحبانِ کمال مثلاً بازی گر، رسیمان باز، لعبت باز، حقّہ باز، منقلا، اہلِ بزل، مسخرے، شب باز وغیرہ اس موقع پر حیدرآباد میں جمع ہوتے، اور میدانِ دل کشا کے داو محل میں اپنے اپنے کرتب دکھاتے رہتے۔ اس میدان کے علاوہ میدانِ عالم پناہ (میدان چار کمان) میں بھی ایک بلند اطلس خیمہ کھڑا کیا جاتا اور چبوترے پر مسند ترتیب دے کر بڑے بڑے عہدے دار یہاں بیٹھا کرتے اور رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہوتی۔ بزمِ نشاط گرم رہتی۔

اسی طرح دوسرے ایوان مثلاً محل خاص، ہشت محل، لعل محل، گگن محل، چندان محل سجن محل وغیرہ میں بھی ڈیرے اور شامیانے لگائے جاتے مسندیں بچھائی جاتی۔ ہر جگہ حسبِ مراتب سلحدار، حوالہ دار بیٹھا کرتے اور محفلِ نشاط گرم رہتی۔ تمام خیموں محلوں میں زعفران، صندل اور مُشک وغیرہ کو طلائی و نقرئی بادیوں میں بھر کر ہر روز ایک ایک طبق پان خاصہ کے ساتھ تقسیم کرتے۔ جو ہر محل میں کئی سو بلکہ ہزار سے زیادہ صرف ہوتے۔ ساتھ ہی ہر روز قسم قسم کے کھانوں کے دسترخوان بچھائے جاتے اور تمام خاص و عام کو شاہی دعوت ہوتی۔ یہ تو شاہی محل کے باہر ہوتا۔ خاص شاہی محل کی آراستگی اس سے زیادہ ہوتی، اور مخصوص اور منتخب مہ جمال رقاصائیں اور استادان خوانندہ و سازندہ ملک ہندوستان اور ایران سے آکر بار پاتے تھے۔

اس ماہ کے جشن و میزبانی کے آخر میں بادشاہ کی سواری نکلتی تھی اور دونوں میدانوں کی سیر کرتی۔ اس موقع کے لیے شاہی ہاتھی کو زعفران اور صندل سے دھو کر طلائی زنجیروں، موتیوں کی جھول، مرصع کلغی اور دوسرے زیوروں سے آراستہ کیا جاتا۔ عصر کے وقت بادشاہ اس ہاتھی پر سوار ہو کر میدان کی طرف نکلتا اور جملہ ارکانِ دولت، مقربانِ تخت، سردارانِ عالی شان، وزیران

رفیع مکان، جمعدار، حوالہ دار، سلحدار، ہر طبقہ کے لوگ شاہی سواری کے اطراف پیدل چلتے۔ گانے بجانے اور ناچنے والی رقاصائیں اپنے فن کے کمالات دکھاتی ہوئی شاہی ہاتھی کے آگے آگے ہوتیں۔ سواری کی دھوم دھام، کروفر شان و شوکت، جلوس کے طمطراق کو دیکھنے کے لئے تمام شہر اور اطراف کی مخلوق جمع ہوجاتی مکانوں، بازاروں اور دوکانوں میں اور ان کی چھتوں پر انسانی سروں کے سوائے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ خاص کر میدان میں تو عظیم الشان مجمع رہتا۔ شاہی جلوس میدان چارکمان سے نکل کر چارمینار سے ہوتی ہوئی داد محل کے میدان دل کشا میں پہنچتی تھی۔ یہاں کوتوالی کی چاوڑی تھی۔ اس مقام پر شاہی ہاتھی تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرایا جاتا اور زر وجواہر کی کشتیاں بادشاہ پر سے نثار کی جاتیں اور نذریں پیش کی جاتیں۔ تجار اپنے اپنے تحفے پیش کرتے اور انعام واکرام سے نہال کئے جاتے۔

مولود النبی کے آخری دن میدان داد محل ایک طعام خانہ عام کی صورت میں منتقل کر دیا جاتا اور تمام لوگ خاص و عام ان دسترخوانوں پر کھانا کھاتے تھے۔ اس وقت میدان میں چاروں طرف روشنی کی جاتی۔ تمام میدان روشنی سے جگمگا اٹھتا۔ دولت خانہ شاہی کے اندر اور باہر آتشبازی جلائی جاتی۔ تمام رات کھانے پینے گانے بجانے اور تماشہ کا سلسلہ جاری رہتا۔ غرض میلاد نبی کی خوشی کا یہ جشن بارہ روز تک دن رات جاری رہتا تھا، اور اس میں تیس ہزار ہون خرچ ہوتے تھے[1]۔

اس موقع پر سلطان محمد قلی کی طرح سلطان عبداللہ بھی شاعری کے کمال دکھاتے ہیں۔ ان کے دیوان میں کئی نظمیں یا غزلیں "مولود نبی" کے متعلق موجود ہیں یہاں ہم دو نظم پیش کرتے ہیں۔

---

[1] حدیقۃ السلاطین قطب شاہی صفحہ ۹ ہ تا ۵۶

لکھ فیض سوں پھر آیا دن دین محمدؐ کا | آفاق صفا پایا دن دین محمدؐ کا
اسلام کرا تارا آیا جو نکل بھارا کا | چھپ کفر گیا سارا دن دین محمدؐ کا
یو عید ہمیں ساجے نصرت کے سبھی باجے | ہے جگ کے نبی راجے دن دین محمدؐ کا
گلشن میں شریعت کے پھل کھیلے طریقت کے | پر مل سوں حقیقت کے دن دین محمدؐ کا
روشن ہوئے اسماناں جھمکائے رتن کھاناں | حظ لیوائے مسلماناں دن دین محمدؐ کا
جو یارہ اماماں ہیں لکھ ان پہ سلاماں ہیں | ہم ان کے غلاماں ہیں دن دین محمدؐ کا

صدقے نبی عبداللہ شہ کوں ہے مدد اللہ
پنج تن ہیں گوا باللہ دن دین محمدؐ کا

---

## دیگر

نبی مصطفےٰ کا جو مولود آیا | جہاں صاف ہو سر بسر جگمگایا
فرشتیاں سوں مل جبرئیل آج خوش ہے | طبل عیش کا عرش پر خوش بجایا
خوشیاں کے کھلے پھول بن یک طرف تھے | زمیں شاد ہوئی ہور گگن ذوق پایا
محمدؐ کے صدقے تھے سب دور کر غم | عجب کچھ خوشی منج الٰہی ولایا
اُترنے لگی رحمت آسمان پر تھے | جو بہتر سول یو سبز بانی گنایا؟
سہیلیاں ہو گا دو سہیلا نبی کا | کہ یو سب سہیلیاں پہ تاج ہے سہایا

نبی کا ہوں میں سیوکی خاص تو یوں
ہو سلطان عبد اللہ جگ میں کوں بہایا

---

**عید رمضان** عید رمضان میں گولکنڈہ اور حیدرآباد کی پوری فضا بدل جاتی تھی۔ رمضان کے چاند کے ساتھ ہی لہو و لعب ختم ہو جاتے تھے۔ شراب کی دو کانیں اور سیندھی خانے بند کر دیئے جاتے۔ رمضان المبارک کا اس قدر احترام کیا جاتا تھا کہ شاہی محلات میں بھی شراب اور عیش و عشرت موقوف ہو جاتی تھی۔

شوال کا چاند نظر آتے ہی حالت بالکل بدل جاتی تھی" کلید مے کدہ گم گشتہ بود پیدا شد" کا عملی نظارہ ہوتا۔ عیش و عشرت کے شادیانے بجنے لگتے۔ مصری، بادام، پستے، دودھ اور کھجور خاص اہتمام سے منگوائے جاتے۔ شیر خرما اور سیویوں سے ضیافت کی جاتی تھی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ اس موقع پر ضرور نظم کہا کرتا تھا، اس کے کلیات میں کئی نظمیں عید رمضان سے متعلق درج ہیں۔ سلطان عبد اللہ قطب شاہ نے بھی اپنے نانا کی طرح عید رمضان پر غزلیں کہی ہیں۔ ایک نمونہ درج ہے۔

روزے کھلیں پیاری لیا رہی پرم پیالا
جوبن پر ہات سٹئے کرتا ہے من الا لا
ہاتھ سوڈالنے

دل کا کلف توں کھولے گے کے کیلے سیتی
سینے میں دل کھلیا ہے دل میں پڑیا اجالا

زنار پکڑی رونق تسبیح کا اُٹھیا رج
زاہد شراب پینے عاشق تھے ہے اتالا

مستانے سب گئے ہیں مے خانے آج گھر گھر
مد پینے کی رضا کی جی تھے ہے چاند بالا

جوبن سو موہنیاں کی، پتلیاں ہیں جوں صراحی
پیالا ادھر نقل سوں لب بوسی کا نوالا

شیر ہے شراب موہن خرما سو تیرے ادھران
کھولیا ہوں آج روزہ سینے سوں تج کوں لالا

صدقے نبی رکھیا یا عبداللہ شہ کے من کوں

تج روپ کا پوچھکا تج نین کا یو جا لا

روزے ختم ہونے شراب کا دور چلنے عیش وعشرت کا آغاز ہونے کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔

سلاطینِ قطب شاہی شیعہ تھے۔ عید غدیر نہایت اہتمام سے منائی جاتی تھی۔ عید غدیر سلطان محمد قلی نے اس موقع پر کئی نظمیں لکھی ہیں اور بتاتا ہے کہ عیدِ غدیر کے دن علیؓ کے نام خدا نے خلافت بھیجی۔ عید غدیر شیعوں کے لیے عید کبیر ہے اور خوارج کے لئے باعثِ غم والم۔ تمام عیدوں کی خوشی اس عید میں بھرپور نظر آتی ہے۔

عبداللہ قطب شاہ نے بھی اپنے نانا کی پیروی میں عید غدیر کے متعلق کئی غزلیں موزوں کی ہیں۔ ایک نمونہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

اے مومناں خوشیاں کے چشمیاں کون نیر آیا

یعنی جہاں میں سر تھے عید غدیر آیا

ہے عید یو شرف کا شاہنشہِ نجف کا

سارے ولیاں کی صف کا وہے ہو امیر آیا

فرماں تھے ربی کے رتباں سو صاحبی کے

امت کوں سب نبی کے ہو دست گیر آیا

حضرت رسول صاحب کا سو وہی ہے نائب

تو مظہر العجائب ہو بے نظیر آیا

جم اس کی آل تھے یوں روشن جہاں اچھے نیوں

ہر یک امام سو جیوں بدرِ منیر آیا

صدقے نبی کے دل دھو سب تھے علی سوں یک ہو
شاہاں میں عبد اللہ سو روشن ضمیر آیا

---

**بسنت** بسنت اصل میں سنسکرت لفظ وسنت ہے جس کے معنی ہیں سال کی پہلی فصل جو چیت اور بیساکھ تک رہتی ہے۔ اس زمانہ میں چونکہ پھولوں کی کثرت ہوتی ہے اس لئے ہندو پھول دیوتاؤں کے مندروں پر چڑھاتے تھے یا تالابوں پر لے جاکر بہا دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ ایک عید یا میلہ بن گیا۔ حضرت امیر خسروؒ کے زمانے میں دہلی کے مسلمان بھی پھول درگاہوں پر چڑھانے لگے تھے۔

غرضکہ بسنت کی عید موسم بہار کی آمد آمد پر منائی جاتی ہے۔ سلطان محمد قلی نے گولکنڈہ میں اس تقریب کو خاص اہتمام سے جاری کیا۔ وہ ہندوستانیت کو پسند کرتا تھا۔ اس کی رعایا میں ہندوؤں کی کثرت تھی۔ اس کے محل میں ہندو رانیوں اور ملازمین کی کمی نہیں تھی۔ اس طرح وہ بسنت کو بھی ارمانوں اور بڑی شان سے مناتا تھا۔ اس کی نظمیں جو اس تقریب پر لکھی گئی ہیں وہ موسم کے لحاظ سے شہوانی جذبات سے مملو ہیں۔ اور نہایت عریاں طور پر جذبات کا اظہار کرتی ہوں۔

سلطان عبد اللہ ہر ایک بات میں اپنے نانا کی سنت پر چلتا تھا۔ اس کے زمانہ میں بھی بسنت کی تقریب اسی شان و شوکت اور اہتمام سے ہونے لگی جیسا کہ اس کے نانا کے زمانہ میں ہوتی تھی۔ شاہی قصر اور باغوں میں پھولوں کے انبار جمع کردیئے جاتے تھے۔ اور حوضوں کو رنگوں سے بھر دیا جاتا تھا۔ راگ رنگ، شراب و شاہد کی افراط ہوتی تھی، بڑی مسرت و شادمانی سے یہ تقریب ہوتی تھی۔ سلطان عبد اللہ نے اس موقع پر کئی غزلیں موزوں کی ہیں۔ یہاں ہم دو نظمیں پیش کرتے ہیں۔

میرے تن من کو رنگ رنگ لایا　　　سکھی جیوں رُت بسنت کا شاہ آیا
جیسے

کول لوچن کول جوبن کول من کول ایسی نول نے آ کھلایا
نین رخسار آدھر قدمل سہے یا سرو پھل بسنت کے بار لایا
بہت چالے چترین کے کیا آج رجھایا ہے منجے شہ نے رجھایا
جتنے گن میں بھی پورا ہے پیارا خدا کی ذات کا سجلا ہے سایا
سکیاں کے دل میں پیرت ہو کے پھرتا تو یک دل تے بتے دل کوں رجھایا
نبیؐ کے صدقے عبداللہ سلطان
عجب اوتار پرس ہے جگ میں آیا

---

## دیگر

رنگ بھریا منج گھر میں آج آیا بسنت غیب تھے تازہ طرب بھایا بسنت
جیوں ابھال یک دہر تھے آفاق پر رنگ کا برسات برسایا بسنت
تازگی موں پھول تمنے کھل تمام ہر طرف تھے آج جھنکایا بسنت
رنگ بھریاں کی بزم کوں بھو رنگ سوں کر بہارستان دکھلایا بسنت
لاہراجی کو پیالی سوں سگلے سر خوشی کا کام فرمایا بسنت
عاشقاں کو سر تھے معشوقاں کے آج عشق کے جالے میں اُلجھایا بسنت
لکھ دعا کر آج منج لکھ ذوق سوں تخت پر عشرت کے بسلایا بسنت
کھول شہپر جیوں ہما اقبال کا چھانو میرے سیس لا پر چھایا بسنت
مصطفیٰؐ ہور مرتضیٰؓ کے صدقے آج
شاہ عبداللہ کو بھایا بسنت

---

**نوروز**

نوروز ایرانیوں کی عید کا دن تھا جس روز آفتاب زمین کا ایک دور ختم کر کے نیا دور شروع کرتا ہے اس کو نوروز کہتے ہیں۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ دنیا ایک نئی کروٹ بدل رہی ہے۔ ہر چیز نئی ہو جائے گی۔ گولکنڈہ میں یہ تقریب بھی منائی جاتی تھی۔ خصوصاً سلطان محمد قلی اس دن بڑے اہتمام سے جشن کرتا اور عید کی خوشی مناتا تھا۔ اس کے کئی قصیدے اور نظمیں اس موقع کے متعلق ملتی ہیں جس میں وہ نوروز کی خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ اور انتہائی مسرت کی ترجمانی ہوتی ہے۔ سلطان عبداللہ نے بھی اس سنت کو پورا کیا ہے۔ ایک نظم ملاحظہ ہو۔

منجے نوروز یتے اگلا صفا تج مکھ جدا دیتا
سے آمادہ تجھ منہ
صفا جیسا جو منگتا تھا سو ویسا منج خدا دیتا
مانگتا
ترا قد پھول کی ڈالی نمن کھل مکھ کانی تھے
مانند
خوشی پا جیو کا بلبل سو غم کوں سب وداع دیتا
وداع
بغیر ساقی بغیر پیا پرت بغیر پیارے
بغیر محبت
دنیا کچ نیں کہ منج قلقل صراحی کا صدا دیتا
محل کا برج منج دل ہے کہ تیرے عشق کا سورج
کیا جیوں آکے منزل سو منج لکھ فائدہ دیتا
آنند ہور ذوق منج تیری طرف تھے لے جتا ہے کہ اچھل
مجھ سے آپ تک
فلک اپرال تھے ہاتف اپنے ہو منج ندا دیتا
محبت ہور وفا تیرے کوں جو دیکھیا یار پا ازبا
اس پر منج اس از انتہا تا ابتدا دیتا
ادایاں سب کی تو دیکھیا و لیکن یو ادا تیرا
عجب کچ ہے خدا منج کوں عجب کچ یو ادا دیتا

منجے نوروز ہور شبرات ہر دن ہر رین سے کر
وہ تیرا زلف ہور چہرا گواہی آسدا دیتا

مسیحا اس زمانے کا کہاؤں تو عجب کیا ہے
کہتی منج عمر کی بیلا ابد لگ خوش بدا دیتا

چھتر ہو اس اماماں کا رہیا ہے چھانو منج سر پہ
امت کوں جس اماماں کا امامت اقتدا دیتا

نبی کے صدقے عبد اللہ سدا توں شکر کر اس کا
جکوئی منج کو نوازیا ہور شاہی کا ہدا دیتا

---

**مرگ یا موسم بارش کا آغاز** دکن میں بہار کا موسم نہیں ہوتا، مگر موسم بارش ہی یہاں کا بہار کا زمانہ ہے۔ بارش سے ندی نالے بہنے لگتے ہیں۔ تالابوں، چشموں میں پانی بھر جاتا ہے۔ ہر طرف سبزی کا زمردی فرش ہو جاتا ہے۔ تمام درخت برگ و بار سے جھومنے لگتے ہیں۔ زمین کے خشک ذرہ ذرہ میں جان پڑ جاتی ہے۔

سلطان محمد قلی مرگ (بارش کے آغاز) کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ اس روز بڑی دھوم دھام سے بزم نشاط آراستہ ہوتی۔ شراب کے دور چلتے۔ مطربانِ خوشنوا رقص و سرود کے کمال دکھاتے۔ باغوں میں جھولے ڈالے جاتے۔ شاہی بیگمات اور رانیاں مشک اور زعفران و عنبر مل کر اپنے جسم کو معطر بنا لیتیں۔ بیر بہوٹی کے رنگ کے سرخ کپڑے زیب تن کرتیں۔ پھول اور پان کے طبق تقسیم کیے جاتے۔ تمام شاہی ایوانوں میں زمردی رنگ کی مسندیں بچھا دی جاتیں۔ ہر طرف خوشی اور خرمی کا اظہار ہونے لگتا۔ سلطان محمد قلی نے کئی نظمیں مرگ کے متعلق لکھی ہیں اور اپنے شاعرانہ

کمال کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ سلطان عبداللہ کے زمانے میں بھی مرگ کا جشن
اسی اہتمام اور اسی شان سے ہونے لگا جیسا کہ اُس کے نانا کے دور میں ہوتا تھا
اس نے بھی مرگ پر نظمیں لکھ دیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

مرگ گرجیا سہیلیاں ہوا لایو راگ ملہارا
گرجا سہیلیو
کہ خوش موتیاں کے باراں ہو برستے میگھ کے دھارا

جھبکتیاں بجلیاں گھن کیا اتم پتلیاں ہو کندن کیاں
کھلتیاں کوئلاں بن کیاں ہتا ہنگام کا بارا

ہری ہور ہر تری ساری دسے پاچال میں جیون ناری
صفا دسے چرخ زنگاری کھلیا جیون پھول ہر تارا

اُمنگ سوں آج اے ساقی دے پیالی بھر مئے باقی
کہ گزری حد تھے مشتاقی ترت کر عیش کا چارا
جلدی

---

## تغزل اور تصوف

معشوق سے گفتگو، رازونیاز، عشق و محبّت کی داستان
غزل کا سرمایہ ہوتا ہے۔ مگر اردو کے زیادہ تر شعرا
فرضی معشوق کی ستائش کرنے کے عادی رہے ہیں۔ اس لیے اردو کی شاعری
بدنام رہی ہے۔ لیکن سلاطین قطب شاہی وغیرہ نے غزلوں میں جو کچھ بیان کیا ہے
وہ اصلیت کے خلاف اور فرضیت پر مبنی نہیں تھا، کیوں کہ اُن کے قصر اور ایوانوں
میں خوبی اور رعنائی کے مجسّم پیکروں کی کمی نہیں تھی۔ آٹھوں پہر حسن و عشق سے
سروکار رہا۔ اس لئے اُن کے کلام میں اصلیت کا رنگ جھلکتا ہے۔

اس کے علاوہ ہر غزل گو شاعر کچھ نہ کچھ تصوّف کے متعلق بھی کہتا رہا ہے۔ ان
شعرا کے برخلاف جو نہ حقیقت صوفی تھے اور ان پر تصوّف کا رنگ چڑھا ہوا تھا دوسر

شعرا بھی کم وبیش تصوّف کا بیان کرتے رہے ہیں۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ نے بھی عشق و محبت کے ترانے گائے ہیں تصوّف پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ حافظ کی غزلوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ اپنے نانا کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے کلام میں وہ بلندی اور عمق، شیرینی اور حلاوت نہیں ہے جو محمد قلی کے عشقیہ کلام میں پائی جاتی ہے۔ سلطان عبداللہ کے عشقیہ کلام کا کا کچھ نمونہ حسبِ ذیل ہے۔

گوری نگٹ کی کسوت بھر تن گئی ہے آلا ۔ یا سور آذی پر پایا ہے یوں اُجالا
یا پھول ہیں پتیاں ہیں بارات میں ہیں جگنے ۔ یا جوہراں کے دریا کوں آئیا اُجالا
یا مکھ کمل کھلیا ہے یا چاند ہے پنم کا ۔ یا نور کا ٹھسا ہے دستا عجب جمالا
یا قد سروپ ہے وو یا زلف کا الف ہے ۔ یا روپ لے بشر کا نچیا ہے پھول ڈالا
یا دو دسن آہیں یا یاقوت ہیں جھلکتے ۔ یا ہیں انار دانے اپروپ بے مثالا
جوبن ہیں یا کسی سو گینداں ہیں یا جراُت ہے ۔ یا پھل سنگار بن میں یارا ہیں ہیں اُتالا

صدقے نبیؐ کے ایسی صاحب جمال بالی
شاہ عبداللہ کو بھر بھر دیتی ہے خوش پیالا

---

اس مسلسل غزل میں معشوق کے سراپا کی جو تصویر کھینچی ہے وہ گویا حقیقی اور اصلی ہے۔ ایک دوسری غزل اسی نہج کی ملاحظہ ہو۔

کلی سا کھول لب دامنج کنارے پھول کی ڈالا ۔ پرم کے باغ کا لالہ ہے یا نج ہاتھ میں پیالا
بھنور کر جیو کوں میرے آدکھ لب دائیا تیرا ۔ کمل مکھ ہور نین نرگس رنگیلا گال گل لالا
اگر ہور مکھی، عنبر، چندن ہور عود لو بھانے ۔ یو سب تج آنکھ کی باسو تھے پر مل پائے تیں آلا
تری ناسک پہ تھے قرباں ہونا ہر گھڑی چنپا ۔ ترے بالاں پہ تھے بلہار جاتا ہر گھڑی بالا

چنبلی، سیبنوتی، رابیل ہو تج پھول کے عاشق — کہا تیری سکا نیاں خط دیاں لکھ تج کوں دُرجالا

مٹیے

چمن کے جھاڑ سب خوش ہو نگل پھولاں سا تیرا — سہیلا گا دتے پاتاں کے ہاتاں سو بجا تا لا

نبی صدقے توں جانی کے تازے گلعذاروں ہیں
رجھایا شاہ عبداللہ کوں تیرا چھند بھر یا چالا

---

ہر دم اس بادِ صبا پر مرحبا صد مرحبا
جو منجے تج پھول کا دیتا ہے باس آ ہر صبا

---

سب رات خوش صبا تلک یک رنگ اے سجن
خلوت تمام تج سوں منجے بے حجاب تھا

---

توں شہ کی پیاری شہ تیرا ہے پیارا — اہے پھل باس جیوں مل ایک ٹھارا

رہے پھول بُو جیسے طرح

نین او پر الکھ بھکری ڈھلک کر — جھلکتا سیام جل میں جا تو تارا

شام

کمر تیری سنٹرتی ہاتھ میں نیں — کنے پکڑیا تیں مو تھتے جھا بھارا

پھس جانا — کسی نے پکڑا نہیں بال سے بارش

قدم تج نیہ میں جاں میں رکھیا ہوں — وہاں فرہاد کیا مجنوں بچارا

عشق

تیرے ہونٹاں اتنے میٹھے ہیں موہن — کہ ایلوج اس انگے لگتا ہے کھارا

مصری

سینہ چیڑ لیتا ہو ساں سوں عاشق      کہ بھوں تیرا محبت کا ہے آرا
نبی کے صدقے عبداللہ لبدیا
کہ تیرا حسن ہے لبدان ہارا

---

سکھی عید گھر آئی ہور شہ بھی آیا      سو پیالا نوالا کھلایا پلایا
ہیں کا رنبھا ار بسی آکے ناچیاں      تو ہا ہا و ہو ہو نے مندل بجایا
بدھے بازو بند بند چولی کے چھوتے      منجے شہ چپکل بوں گلے سوں لگایا
جھمٹ کر
منجے سیج پر آو کہے شہ توں نے      نہ آسوں گگر بول نیں نہ میں آیا
پلنگ
جو شہ بات بولیں گے وہ بات سن توں      وہی خوب ہے کچ جکیچ شہ کوں بھایا

---

نکلتا ہے چندنی میں جو چاند ہمارا      تو گھلتا ہے لاجوں تھے چاند ہور تارا
جوانی کو دیکھ اپنی مغرور ہوئی توں      دوانی جوانی کو کہتا ہے بپتیارا
جوانی وہی ہے جو عاشق کوں کام آئے      کہ عاشق ہے جانی یہ عاشق بچارا

---

عجب کل رات میں یک خواب دیکھا
ستے تیوں گود میں مہتاب دیکھا
سوتے میں

---

سائیں سو خلوت کا اوّل گمنجے کوں جاگا دیکھنا
جگھ
باطن کی انکھیاں سوں بزاں جو لکھ دکھا گا دیکھنا
بعد ازاں

---

نہنی توں بڑی بخت کی موہنی ہے
کہ شہ من موہن تے من اپنا لگا یا

---

پیالی پیالی پیالی یو پینا
دنیا میں دنیا میں یہی کچھ ہے جینا
گلشن ہے توں پیاری، بلبل ہے دل ہمارا رنگ باس دونوں تج میں پھل ہو پھلیا نظارا

---

جے کوئی پرت کی آگ کی سو سیانہ ہوسے آنچ کوں
جو کوئی برداشت نہ کرنا
پختہ نہیں وو خام ہے اس خام سیتی کام کیا
جے عاشقاں دل ہور آنکھیاں تج زلف رخ سوں لائے ہیں
اس عاشقاں کوں کفر ہور اسلام سیتی کام کیا
یو رمز ہر کس کے حضور اظہار کرنے کا نوی
یاں یات عارف سات ہے کچ خام سیتی کام کیا

---

کسے پیار کرنا کہاں ہے پیارا ہمیچ ہیں ہمارے نہیں کئی ہمارا
کوئی
ہمیں دل لگاتے دو دل نیں لگاتے تو اس دل لگانے کوں کیا ہے پتیارا
ہم تو دو
عشق کا لذت دو جو معشوق منگنیا نہیں تو عشق نہیں یو محنت ہے سارا
ایکس کے بدل ایک تیتا مزا ہے جو یوں ہوئے تو دل سے دل لا پنسارا
ایک کے بدلے دوسرا دل دیتے والا

جو عاشق کو معشوق منگتا پچ نہ ہو      تو کیوں جیوے حیران عاشق بچارا

مانگتا ہی نہ ہو

وو آئے تجھے پر بات دل کی کہا نیں      مبادا کرے کام کپر کر دو بارا

وہ

نبیؐ صدقے عبداللہ بولیا یوں بولاں

کہ جیوں پھول چن چن کے گند تا پھلارا

پھول والا

---

جیسا کہ قبل ازیں تذکرہ کیا گیا ہے کہ سلطان محمد قلی کی طرح سلطان عبداللہ نے بھی خواجہ حافظ شیرازی کی بعض غزلوں کو دکھنی غزلوں میں ترجمہ کیا ہے ۔ یہاں دو غزلیں پیش کی جاتی ہیں ۔

عشق میں جاناں کے ثابت اچھ توں اے جاں غم نہ کھا

عہد و پیماں رکھ درست اپنا یہاں ہاں غم نہ کھا

درد منداں کا سو درماں عین اس کا لطف ہو

ہووے گا اک بارگی مشکل سب آساں غم نہ کھا

رات اندھاری ہے کہ ہرگز تو پشیمانی نہ کھینچ

دن بھی آوے گا نکل روشن ہو رتاباں غم نہ کھا

یو دنیا دو دن کی ہے مہماں اسے کچ ٹھیر نہیں

دل نہ باندھ اس سات توں خوش حال رہ ہاں غم نہ کھا

بولتا ہوں کھول میں یو قال گھڑی باندھ لے

ہے تجھے جمعیت آخر اے پریشاں غم نہ کھا

خار خارا اپنے سینے کا دور کر یک دھر تجھے

رکھ اپس کوں ہر رہنا جیوں پھول خنداں غم نہ کھا

مدّعا بر لیاں ہار اسو خدا ہے ڈر نکو

غم ہتے اکثر تج اوپر پڑتیاں ہیں چھایاں غم نہ کھا

عبدلاصد قے نبی کے راج کو تو ذوق سوں

ہے ترے سر پر قوی بارہ اماماں غم نہ کھا

---

## دیگر

خبر دے جام کوں ساقی کہ دور آیا ہے پھر جم کا

صراحی ہات میا نے لے انگن میں چاند ہو چھم کا

جکچ ہمنا کوں بھایا سوں کھڑا ہے آسماں یالو

بدل ہو دل پر چھایا سو کدورت دور کر غم کا

منجے اس چشمے تھے اے بانی پلا امرت کا پانی

جو سارے عاشقاں گیانی کہیں منج خضر عالم کا

کدھیں تیری پرت کی دو اگر باتاں سنے گا تو

دھلے یک رنگ پانی ہو کلیجا گل کے رستم کا

جتاں ہیں دل کوں دیوو ل دھیڑ عاجز ہو دستے تدبیر

صبر دکھائی دے

کہ تیرا زلف ہے زنجیر ابراہیم ادہم کا

کلیاں منج اس کیاں یارا کھلیاں ہیں آج ایکبارا

بھیا ہے منج طرف بارا مسیحا کے نگہ دم کا

جادھا لگ عبدلا دم ہے نبیؐ صدقے نہ کچھ غم ہے
کہ منج مکھ پھول پر نم ہے علیؓ کے حب کی شبنم کا

---

نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں جو دیوان موجود ہے اس میں ردیف الف کے بعد ب اور ث کی چند ہی غزلیں ہیں۔ یہاں ردیف ب، ت کے ایک دو شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

تیرے درشن کوں اے محبوب آئے ہیں حبیباں سب
دکھا درشن جو ہو ویں راکھ جل کر سکوں رقیباں سب

---

میں ازل کے دیس تھے آیا ہوں عاشق ہو کر
سو سنے خاطر کوں تیرا لطف ہور تیرا عتاب

زلف تیرا جیوں ترے رخسار سوں لگتا ہے نیراں
رات ساری تج سوں مل گمنا صبا لگ بیحجاب

---

آج زہے بخت جو آئی سعادت کی رات
چاند سوں میرے ملا غم تھے منجے دے نجات

---

**مرثیہ** قطب شاہوں کے زمانہ میں جو عیدیں اور تقریبیں منائی جاتی تھیں اُن میں سے ایک ماہِ محرم میں مجالسِ عزا بھی ہے۔ سلطان محمد قلی نے محرم کے مراسم کو اس خوبی سے رائج کیا کہ نہ صرف شیعہ اور سنّی بلکہ ہندوؤں نے بھی اُن کو قبول کر لیا تھا، اور پہلی محرم سے بارہ تک ہر متنفس بلا تفریق مذہب وملت ان میں حصہ لیا کرتا تھا، جو مراسم ہوا کرتے اُس کو قطب شاہی مورخ نظام الدین (جس نے عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں اپنی تصنیف کی تھی) کے

الفاظ میں دیکھنے کے قابل ہیں، وہ لکھتا ہے۔

"قطب شاہی سلطنت کا قدیم طریقہ ہے اور خاص کر محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ سے یہ رواج ہے کہ محرم کا چاند دیکھتے ہی خود بادشاہ بھی اورنگ زرنگار سے اُتر جاتے اور لباسِ شاہی کو جامۂ عزا سے تبدیل کر لیتے۔ اور تمام قلمرو قطب شاہی میں کہیں کوس، نقّارہ، طبل یا دمامہ نہیں بجتے۔ اور گانے بجانے والے بھی اپنے تمام آلاتِ موسیقی کو غلافوں میں رکھ دیتے۔ شاہی اور عام باورچی خانے میں گوشت کی آمد بند ہو جاتی، مسکرات، تاڑی، سیندھی، بھنگ اور دیگر نشہ آور چیزوں کی دکانیں بند کر دی جاتیں، نہ قصاب گوشت فروخت کرتے اور نہ تنبولی پان، اسی طرح شہر کے حماموں میں حجام بھی اپنا کام بند کر دیتے۔ بادشاہی عاشور خانہ کے صحن میں طاقچوں کی دس صفیں ایک دوسرے کے متوازی بنائی گئی ہیں۔ اور ہر صف میں تقریباً ایک ہزار طاقچے ہیں تاکہ اتنے ہی چراغ روشن ہوں اور قاعدہ یہ ہے کہ پہلی شب میں پہلی صف روشن کی جاتی ہے اور دوسری میں دوسری۔ اسی طرح دسویں کی رات پوری دس صفیں روشن ہو جاتی ہیں۔ دس ہزار چراغوں کی روشنی سے عاشور خانہ بقعۂ نور بن جاتا ہے۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے چراغدان بھی بصورتِ اشجار ہر شاخ پر بنائے گئے ہیں، جن میں سے ہر ایک میں ایک سو بیس شمعوں اور چراغوں کی روشنی کا انتظام کیا گیا ہے۔ ایوان میں اور حوض کے اطراف قدم سے بھی بلند کافوری شمعیں ہر رات روشن کی جاتی ہیں۔ عاشور خانہ میں سیاہ پوش عزاداروں کا صبح و شام اژدہام رہتا۔ خوش آواز ذاکر اور خوش خوان نغمہ پرداز دل سوز مرثیے اور غم اندوز

اشعار درد و اثر سے پڑھتے رہتے سننے والوں پر ان سے بے اختیار رقت طاری ہو جاتی۔ عصر کے وقت بادشاہ (عبداللہ قطب شاہ) بنفشئی رنگ کا لباس پہن کر آہستہ رفتار سواری میں یا سیاہ مخمل کے سنگاسن میں بیٹھ کر سیاہ پوش مقربوں مجلسیوں، امیروں اور وزیروں کے ساتھ الاوہ میں آتا۔ دو خوش آواز ذاکر شاہی سنگاسن کے دونوں طرف خود بادشاہ کے مصنفہ مرثیے پڑھتے ہوئے آتے۔ جب بادشاہ عاشور خانہ کے دروازے میں داخل ہوتا تو سواری سے اُتر کر برہنہ پا آتا اور اپنے ہاتھ سے علموں پر پھول چڑھاتا، اور شام کے وقت تمام کافوری شمعوں اور ایوانوں کے برابر کے چراغوں کو بھی اپنے ہاتھ ہی سے روشن کرتا۔ اس وقت مرثیہ خوانی ہوتی رہتی اور ائمہ معصومین کی مدحیں پڑھی جاتیں۔ چراغ روشن کرنے کے بعد ایک فصیح و بلیغ خطیب کھڑا ہو کر شہدائے کربلا کی ارواح کے لئے با آواز بلند فاتحہ پڑھتا۔ اس کے بعد بادشاہ دولت خانہ عالی کو واپس ہوتا۔ اور وہاں کے عاشور خانہ میں امرا و وزراء کے ساتھ آدھی رات تک ماتم و مرثیہ خوانی میں بسر کرتا۔ یہاں بغیر گوشت قسم قسم کے کھانے تیار رہتے اور شربت وغیرہ کی تقسیم عمل میں آتی۔

(حدیقۃ السلاطین ص ۴۲ تا ۴۴)

اس صراحت سے واضح ہے کہ عبداللہ نے مرثیے بھی لکھے تھے، مگر افسوس ہے کہ یہ اب ناپید ہیں۔ اس کا جو دیوان ہمدست ہوا ہے اس میں کوئی مرثیہ نہیں ہے وہ ناقص ہے۔ البتہ ہم کو ایک مرثیہ مولوی صفی الدین مرحوم کی مملوکہ بیاض سے ہمدست ہوا ہے اس کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

## مرثیہ

علی ہور فاطمہ کرتے ہیں دونوں آج زاری بھی
حسن کا ہور حسین کا ڈولہ لے آیا جاگ پو خواری بھی

حسین جب چلے لڑنے سراں میں برلگے پرنے
شہیداں ہر طرف چرنے لگیا یو دوکہ بھاری بھی

وصیت یو کئے جاتے نکو روتم آپ بہاتے
تبھی تو پھر کو نیں آئی اجل آئی ہماری بھی

یتیماں کو سنبھالو ہور غیبر تبھی سکھالو ہو
بہوت مہراں سوں پالو ہور رہیں نگے یادگاری بھی

پڑسے گا غم تمن پر جب میرا غم یاد کرنا تب
یو دوکہ یاد آوے گا ہر وقت کرو نیں اشکباری بھی

سوتے یو غم حرم سارا مسلم ہور زادھارا
سو ناری کل گلا نعرہ پکڑ کر بے قراری بھی

شہربانو کہے آکر کہ اے سنسار کے سرور
منجے غربت منے بہا کرنجا ڈ چھوڑ باری بھی

منجے کے جاوتے یو حال تمن بعد از مرا کیا حال
کرو مت غم منے پامال دیو درس تمہاری بھی

علی اکبر گئے ہیں جانوں سو پیاساں ہیں جو بابے لاؤں
زخم کھا کر آئے پھر اب نہانوں ہی ہے شکساری بھی

دیکھو طفلاں منگتے پانی نہ کر ذرہ مہربانی
ستم سوں تیر مارتے گئے او نابکاری بھی

حسین پانی پیئے اسے تیر بداں تیر برسائے
سو پانی پینے نیں پائے لگے ملہ لہو کی دھاری بھی

بغیر از ظلم بیدادی نہ تھی اس وقت کچھ شادی
ہوئی قاسم کی دامادی دیکھو تقدیر باری بھی

سو دیدیاں نبوت بوند کر جو خوشیاں ساتپوند کر
حرم کوں لے چلے بند کر پڑیا جگ سب اندھاری بھی

عروس آکر پکڑ سن چلے تو شوہر جب جیو جن
نشانی کچھ دیو منج کن سو پیار اسنبل تمھاری بھی

حسین کا وقت جب دو انیاں شمر نے آ گلا کاٹیا
حرم کا دیک سنیا پیا بٹنا دیتا اور اپکاری بھی

ننگے پائوں چلے آئے سو پاواں کوں چھلے آئے
اگن دیکھین چلے آئے نکتے دوستداری بھی

گدیت گنے سینے پیش آ قیامت کچھ نہ اندیشہ
اپن مارا یا اپنے نلیشہ تو پایا گرفتاری بھی

یزید دیکھا حسین کا سر پھر آیا پیٹ سوں بھر بھر
سو دیکھو لعنتی کافر کیا کفر اختیاری بھی

کرو اے دوستاں ماتم ثواب ہے بہوت کرنا غم
مدد ہو ویں گے امام ہر دم کی ہے امیدداری بھی

حسین کا دوکھ دل میں آن لگا یک چپٹ سوں اُٹھ وہاں
کرے قطب عبداللہ سلطان در کنوسوں شہریاری بھی

---

**گیت** سلطان عبداللہ نے کئی گیت بھی لکھے ہیں۔ یہ گیت ایک بیاض محکومہ نواب محمد نصیر الدین خاں مرحوم میں موجود ہیں۔ ان کے متعلق آقا حیدر حسن صاحب نے رسالۂ نظام ادب میں صراحت کی ہے۔

سلطان کی گیتوں سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ کی طرح عبداللہ کو بھی موسیقی میں دست گاہ حاصل تھی۔ سلطان کی کئی گیت میں ان کو "نفش" کے نام سے لکھا گیا ہے۔ اور ہر نفش کا مقام راگ اور راگنی میں بتا دیا ہے، جن راگ اور راگنیوں میں گائے جانے چاہئیں اس کی بھی صراحت کی ہے۔ یہاں ہم صرف دو گیت بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

در مقام کیدار

| | |
|---|---|
| پیاری مدبھر دینا مجکوں | گھڑی گھڑی کرتی ہوں منت تجکوں |
| ہات میں تیرے جڑت صراحی | پیالا باج کا زنگاری |
| مجکوں پلا توں اپنے ہاتوں | توج اُپر میں واری |
| بج سوسن لاگی اور خماری | ہوں ری حسن کی میں پیاسی |
| اپنے نین میں بھرے بھرے لیئوں | تو موج کی مدواسی |
| کیا آج موں تجے مست دیوانی | سلطان عبداللہ ساقی |
| اس ری کیا میں رگ رگ توہیں | نا ڈل رہیا مج باقی |

---

لہ اس مرثیے میں غلطیاں بہت ہیں چونکہ کوئی اور نسخہ نہیں ملا اسلئے صحت کا موقع نہیں تھا
دسمبر ۱۹۴۲ء

## در مقام رام گیری

پرت کا مشکل نباؤ ہے     پیاری تو نچ نیپا ڑی
دھرتا ہے رے عشق نے     بہوت دھات کو ہاری
تج پکڑے جن جہان سٹ     اور برہ سون لو جی
تن من جانے جوبن یو     سب تیری کر بوجے
اے تو یان کا نیاؤ نہوے     ملائے ہیں ور جے
بھیدن سارے پرت کے     سمجے کے ہیں بھاتی
مستاں کرمیں بلاؤں     تو اپیں بھی کتیں جانی
نکو آؤ کی تو تا سس     ستم دھس دھس آتی
سلطان عبداللہ سجانی     کریں پرت آکھاڑی
چھاتی سوں لا سیج میں     میرا نیاؤ نیپاڑی
منج میں تج میں پرت     بن کہے کوئی تیں آڑی

---

**تبصرہ** صفحات گذشتہ میں سلطان عبداللہ کا نمونۂ کلام پیش کر دیا گیا ہے اس سے اس کی شاعری کا معیار معلوم ہو سکتا ہے۔ اس نے جو کلام موزوں کیا ہے وہ اس زمانہ کے لحاظ سے صاف اور سادہ ہے۔ خیالات میں ندرت ہے۔ تخیل کی پرواز ظاہر ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے کلام میں وہ زور اور رفعت نہیں جو اس کے نانا سلطان محمد قلی کے کلام میں موجود ہے۔ تاہم اس کو اپنے عہد کا ایک اچھا شاعر تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ اس کا دوسرا کلام، قصائد، مثنویاں وغیرہ ناپید ہیں اور خود غزلیات

کا بھی بہت کم ذخیرہ ملا ہے۔

اردو زبان کی تاریخ کے لئے سلاطین قطب شاہی وغیرہ کا کلام جس قدر اہمیت رکھتا ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ بہرحال سلطان عبداللہ کی شاعری کا کچھ حال قلمبند کردیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ شائقین کے ضیافت طبع کا موجب ہوگا۔

سلطان عبداللہ کا جو دیوان کتب خانہ سالار جنگ میں ہے وہ اب شائع ہوگیا ہے۔

(رسالہ اردو کراچی)

# اردو میں لیلیٰ مجنوں کی داستانیں

اردو میں لیلیٰ مجنوں کی داستان جس قدر مقبول ہوئی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے نہ صرف مثنویوں میں اس داستان کو بیان کیا گیا ہے بلکہ ڈرامے بھی لکھے گئے۔ اسٹیج پر یہ داستان پیش ہوئی۔ حتیٰ کہ فلم بھی بنایا گیا۔ اگر لیلیٰ مجنوں کے متعلق ایک تفصیلی صراحت کی جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ اس مضمون کا تقریباً پورا مواد کتب خانہ نواب سالار جنگ سے حاصل کیا گیا ہے۔

لیلیٰ مجنوں عرب ہیرو اور ہیروین ہیں۔ مگر یہ امر تعجب سے خالی نہیں کہ خود عربی میں ان کے متعلق کوئی داستان نہیں لکھی گئی ہے۔ البتہ قیس (مجنون) کا دیوان موجود ہے۔ اس کے مرتب کرنے والے نے ہر غزل کے ساتھ مختصر واقعات لکھے ہیں، جو گویا ایک داستان کے قائم مقام کہے جا سکتے ہیں۔ اور چونکہ عربی شاعری حقیقت نگار ہوتی ہے۔ اس لئے قیس کا اپنی معشوقہ کا نام لیلیٰ بیان کرنے سے لیلیٰ کا وجود تسلیم کرنا ضروری ہے۔

یوں تو عرب میں لیلیٰ نام کی کئی عورتیں مشہور رہوئی ہیں جو اپنے مخصوص حالات کے باعث عربی ادب اور تاریخ میں شہرت رکھتی ہیں۔ مثلاً ایک لیلیٰ وہ تھی جو ۶۰ھ؁ میں گزری ہے جو قبیلہ بنی ربیعہ سے تعلق رکھتی تھی اور سکینہ بن مزہ کی سب سے چھوٹی لڑکی تھی۔

شاعری میں مشہور تھی۔ اُس نے اپنے شوہر براق بن روحان کے جنگ میں مارے جانے پر دردناک مرثیہ لکھا ہے جو عربی ادب میں ممتاز ہے۔

دوسری لیلےٰ وہ ہے جو لیلےٰ اخیلیہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عبداللہ بن رحال کی بہن تھی۔ شاعری میں شہرت رکھتی تھی۔ ابن الحمیر اسدی کو اس سے عشق تھا، مگر عبداللہ نے اس سے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کی۔ بنی اُمیہ کے دور میں یہ موجود تھی۔ فرزدق جیسا مشہور شاعر لیلےٰ اخیلیہ کی شاعری پر رشک کرتا تھا۔ یہ زمانہ حجاج بن یوسف کی گورنری عراق کا ہے۔

تیسری لیلیٰ بنی عباس کے نامور خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں تھی۔ یہ خارجیوں کے سردار ولید بن طریف شیبانی کی بہن تھی۔ جب ۱۷۹ھ میں اس کا بھائی ہارون رشید کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے مارا گیا تو لیلیٰ خود سپہ سالار بن کر لڑتی رہی۔ اس لیلےٰ کو بعض مشاہیر عرب کی جون آف آرک کہتے ہیں۔ کیونکہ اپنے حسن و جمال اور کمالِ شاعری کے لحاظ سے دور دور تک شہرت رکھتی تھی۔

یہ ہیں وہ لیلائیں جن کا حال اردو مصنفین نے بھی قلم بند کیا ہے[1]۔ مگر وہ لیلیٰ جو قیس مجنوں کی معشوقہ تھی اس کا حال اردو کے تذکرہ نویسوں نے نہیں لکھا ہے کیونکہ خود عربی میں اس کے متعلق کچھ صراحت نہیں ہے۔

چنانچہ عربی کی مشہور کتاب کشف الظنون میں کسی عربی زبان کی داستان لیلےٰ مجنوں کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ ترکی اور فارسی داستانوں کا تذکرہ ہے جو لیلیٰ مجنوں پر لکھی گئی ہیں۔ اس طرح انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں بھی اس نوعیت کی کسی عربی تالیف کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے عربی میں قیس شاعر

---

[1] مشاہیر نسواں مؤلف محمد عباس ایم، اے مطبوعہ ۱۹۰۲ء

کا ایک دیوان ہے جو عشقیہ غزلوں سے مملو ہے۔ عربی ادب میں اس کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ ایک زمانہ میں امتحان "مولوی" کے نصاب میں اس کا انتخاب بھی شامل تھا۔ اور ہم نے بھی پڑھا ہے۔ اس دیوان کا تذکرہ مرزا محمد ہادی رسوا نے اپنی تالیف "مرقع لیلیٰ مجنوں" کے دیباچہ میں کیا ہے جس کا تذکرہ آگے آئے گا۔ بہرحال عربی میں ایک شاعر قیس کا وجود تو پایا جاتا ہے۔ اس کی لیلیٰ فرضی ہو یا اصلی مگر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ (قیس) مجنوں کی معشوقہ لیلیٰ تھی اور قیس نے اپنی شاعری میں اسی کا تذکرہ کیا ہے۔

عربی کے بعد فارسی ادب کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس میں ایک سے زیادہ مثنویاں یعنی داستانیں لیلیٰ مجنوں کے متعلق لکھی گئی ہیں چنانچہ جن فارسی لیلیٰ مجنوں کی داستانوں کا پتہ لگتا ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) لیلیٰ مجنوں مصنف نظامی گنجوی جو ۵۸۹ھ (۱۱۸۸ء) میں تصنیف ہوئی ہے۔

(۲) لیلیٰ مجنوں مصنف امیر خسرو جو ۶۹۸ھ میں لکھی گئی ہے۔

(۳) لیلیٰ مجنوں مصنف مولانا جامی یہ ۸۸۹ھ (۱۴۸۴ء) میں مرتب ہوئی۔

(۴) لیلیٰ مجنوں مصنف ہاتفی ۹۲۷ھ (۱۵۲۱ء) میں تصنیف ہوئی۔

(۵) لیلیٰ مجنوں مصنف قاسمی ۹۷۹ھ (۱۵۷۱ء) میں مرتب ہوئی۔

(۶) لیلیٰ مجنوں مصنف روح الامین مابعد ۱۰۰۰ھ (۱۶۰۰ء)

اوّل الذکر پانچ داستانوں کا تذکرہ برٹش میوزیم کی کیٹلاگ کے مرتب ریویو نے تفصیل سے کیا ہے اور مصنفین کے حالات بھی درج کئے ہیں۔ مگر روح الامین کے متعلق کوئی صراحت ریویو نے نہیں کیا ہے۔ اس لئے یہاں ان کا تعارف کرایا جاتا۔ روح الامین مرزا محمد امین سیلستانی کا تخلص تھا اور ایران سے گولکنڈہ آیا محمد قطب شاہ کے عہد میں موجود تھا۔ میر جملہ کی خدمت پر سرفراز ہوا۔ مرزا محمد امین

ایک طرف سیاست اور تدبر میں شہرت رکھتا تھا تو دوسری طرف علم وفضل میں سرآمد روزگار تھا۔ ان کی کئی تصانیف مشہور ہیں۔ اس نے "خمسہ نظامی" کے جواب میں چار مثنویاں لکھی ہیں۔ یعنی "شیریں خسرو"۔ "لیلیٰ مجنوں"۔ "فلک البروج" اور "مطلع الانظار"۔

روح الامین کی مثنوی لیلیٰ مجنوں کے سوا باقی مثنویاں طبع ہو گئی ہیں۔ ان کے قلمی نسخے بھی بعض کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ان مثنویوں کی داستانوں میں قصّے کا پلاٹ کچھ تو مشترک ہے اور کچھ باتیں جداگانہ ہیں جن کی تفصیل یہاں غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔

اس پس منظر کے بعد اردو داستانوں کی صراحت کی جاتی ہے۔ ہماری معلومات کی حد تک لیلیٰ مجنوں کی جو داستانیں اردو میں لکھی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) لیلیٰ مجنوں۔ مصنف احمد (دورِ قطب شاہی گولکنڈہ) یہ مثنوی سنہ ۱۰۰۰ھ کے قریب مرتب ہوئی ہے۔

(۲) لیلیٰ مجنوں۔ مصنف عاجز (دورِ قطب شاہی)

(۳) لیلیٰ مجنوں۔ مصنف محبوب عالم سنہ ۱۱۰۶ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔

(۴) لیلیٰ مجنوں۔ مصنف عبداللہ کمتر سنہ ۱۱۹۶ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔

(۵) لیلیٰ مجنوں۔ مصنف تقی علی خاں ہوس لکھنوی سنہ ۱۱۹۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔

(۶) لیلیٰ مجنوں۔ تصنیف غلام اعزازالدین نامی سنہ ۱۲۱۳ھ میں مرتب ہوئی ہے۔

(۷) لیلیٰ مجنوں۔ مصنف سید حیدر بخش حیدری سنہ ۱۲۱۴ھ میں لکھی گئی۔

(۸) لیلیٰ مجنوں۔ مصنف شبیر محمد خاں ایمان سنہ ۱۲۱۸ھ کے قریب مرتب ہوئی۔

(۹) لیلیٰ مجنوں مصنف نظیر اکبر آبادی

(۱۰) لیلیٰ مجنوں مصنف تجلی دہلوی ۱۲۷۹ھ میں تصنیف ہوئی۔

(۱۱) مرقع لیلیٰ مجنوں۔ مرزا احمد ہادی رسوا ۱۸۷۷ء میں مرتب ہوئی۔

(۱۲) ڈرامہ لیلیٰ مجنوں مصنف حافظ عبداللہ

(۱۳) ڈرامہ لیلیٰ مجنوں مصنف حسین میاں ظریف

ان کے علاوہ فلم کے لئے جو ڈرامے لکھے گئے اُن سے ہم واقف نہیں ہیں ان تیرہ کتابوں کے متعلق علیحدہ علیحدہ صراحت درج کی جاتی ہے۔

۱۔ لیلیٰ مجنوں مصنف احمد موجودہ معلومات کے لحاظ سے اردو کی سب سے پہلی داستان لیلیٰ مجنوں احمد کی مصنفہ ہے جو گولکنڈہ کے قطب شاہی دور کا شاعر تھا۔ اس کا زمانہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا دورِ حکومت ہے۔ اگرچہ احمد کے متعلق ہم کو تفصیلی حالات معلوم نہیں ہیں لیکن اس کی دو مثنویوں کا پتہ چلا ہے۔ ایک تو لیلیٰ مجنوں اور دوسری "مصیبت اہل بیت"۔

اول الذکر مثنوی کا تذکرہ پروفیسر محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں کیا ہے۔ اور ثانی الذکر مثنوی کا مخطوطہ انڈیا آفس میں ہے۔ "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں میں نے اس کی تفصیل درج کی ہے۔ لیلیٰ مجنوں کی تصنیف کا صحیح سنہ معلوم نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی صراحت نہیں کی جا سکتی کہ احمد نے کسی فارسی مثنوی سے ترجمہ کیا یا یہ اُس کی خود اپنی تصنیف ہے۔ مرحوم پروفیسر شیرانی کی صراحت کے مطابق اس کے ۹۴ منتشر اوراق تھے جو ۹ × ۵ ½ سائز پر لکھے گئے تھے۔ مثنوی کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

اس اللہ کے ناؤں سوں سب جگت  جو دوانی دیاونت کی صفت
سو بانات سب اللہ کوں جم قرار  جو جگ کا دھنی ہور پرور دگار

جو دنیا میں کافر مسلمان کوں
منگے من سو بخشے بہویان سوں

---

کچھ اور انتخاب ملاحظہ ہو۔ مجنوں کا باپ جنگل میں جا کر مجنوں کو تفہیم کرتا ہے۔

کیا پوت کا سکھ دکن آس سو
رہیا پوت کے دکھ سوں نراس سو

تری آگ تھے جیو میرا جلے
تری آہ تھے موم ہو تن جلے

کیتا نوں جلے ہور جالے منج
بتا کیا گلے ہور گالے منج

جو توں ہے پیارنین منج کوں
ہنسوں کیوں جو دیکھوں نن کوں

رکھا اس جو تو لیارے محل
سنجانیا کہ توں جوں جگائے جنگل

جو گھر چھوڑ جنگل بسانے لگیا
سو تج تھے جنگل ہور جنگل بھی جلیا

---

احمد کی یہ مثنوی نایاب ہے اس کا کوئی نسخہ ہماری نظر سے نہیں گزرا،
اور نہ یہ مثنوی شایع ہوئی ہے۔

(۲) لیلیٰ مجنوں کی دوسری داستان کا مصنف عاجز اور بقول بعض ہاشم ہے۔
اس کے دو قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ ایک نسخہ کتب خانہ نواب سالار جنگ میں ہے۔
اور دوسرا نسخہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ کا نسخہ
۱۰×۵ سائز کے ۸۰۳ صفحات پر مشتمل ہے اور جامع مسجد بمبئی کا نسخہ ۵۴ صفحے کا ہے۔
کتب خانہ سالار جنگ کے نسخہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس کا مصنف عاجز ہے
چنانچہ جن اشعار سے اس کی تصدیق ہوتی ہے وہ یہ ہیں۔

کیا ہوں عاجز سمجھ کر بیاں
یو ہے معجزہ سب جگت پر عیاں

---

نہ عاجز ہے محروم شکرِ خدا
وہ ہے شاعروں کی جو صف ہیں کھڑا

---

کرو رحم مجھ پر ہوں بندہ ہیں
مریدی میں عاجز ہے ثابت یقیں

تاریخ تصنیف سنہ ۱۰۴۰ھ ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

ہزار اور چہل تھے یو ہجرت کے سال
ہوئے تب کیا مجنوں لیلیٰ کا حال

---

عاجز نے ہاتفی کی لیلیٰ مجنوں سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

کہتے ہاتفی فارسی سوں
کیا دکھنی قصہ اس رزم سوں

اس کے برخلاف جامع مسجد بمبئی کے نسخے سے ہاشم تخلص اور سنہ ۱۰۴۶ھ میں تصنیف ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

لکھنے والا بندہ ہے ہاشم سہی
اصل سے سمجھ نین لکھے ان لکھی

---

## تاریخ تصنیف

ہزار اور چہل شش تھے ہجری سال    ہوئے پر کہا مجنوں لیلیٰ کا حال

اسی طرح ہاتفی کا تذکرہ اس میں نہیں ہے۔ صرف فارسی سے ترجمہ کرنا لکھا گیا ہے۔

رکھے ہاتھ میں فارسی نظم سوں    کہے ہیں یو قصے دکھنی رزم میں

اس بمبئی کے نسخے میں سنہ کے ساتھ مہینہ کی بھی صراحت ہوتی ہے۔

ربیع الاول یہ مبارک نظام ہوا دن دوشنبہ یہ قصہ تمام
کہا سب قصہ میں سو تقدیر کلام چھ سو بیت و کیتالیس ہوئے ہیں تمام

یعنی ۶۴۱ شعر ہونا بیان کرتا ہے۔ سالار جنگ کے کتب خانے کے نسخہ میں اسکی صراحت نہیں ہے۔ سالار جنگ کے نسخے سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف کے مرشد کا نام میراں محی الدین تھا۔

مدد یا دبادہ ہیں پنجتن امام مدد پیر میراں ہیں محی الدین نام

تذکرہ اولیائے دکن سے ظاہر ہے کہ دکن میں تین بزرگوں کا نام میراں محی الدین تھا۔ ان میں سے ایک وہ ہیں جو شاہ خداوند ہادی خلیفہ شاہ امین الدین علی کے مرید تھے۔ اور ۱۱۲۵ھ میں حیدر آباد میں انتقال فرمایا۔ چونکہ یہ زمانہ مابعد کے بزرگ ہیں، اس لئے غیر متعلق ہیں۔ دوسرے بزرگ شاہ میراں جی بیجاپور کے ہیں جن کا انتقال ۹۰۲ھ میں ہوا۔ یہ بھی غیر متعلق ہیں۔ تیسرے بزرگ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں حیدر آباد میں رہا کرتے تھے ان کا انتقال ۱۰۲۹ھ میں ہوا ہے، اور لنگر حوض کے پاس دفن کئے گئے۔ غالباً یہی بزرگ ہمارے زیر بحث مصنف کے مرشد ہیں۔

چونکہ میراں محی الدین کو حیدر آباد سے تعلق تھا اس لئے عاجز کو گولکنڈہ کے قطب شاہی شعراء میں شامل کیا جاتا ہے۔ لیکن واضح ہوتا ہے کہ ان کو شاہی دربار سے تعلق نہیں تھا بلکہ وہ ایک مذہبی شخص تھے، انھوں نے اپنی مثنوی میں دوسرے شعراء کی طرح بادشاہ کی مدح نہیں کی ہے۔ اگرچہ لیلیٰ مجنوں ایک عشقیہ مثنوی ہے مگر دراصل یہ تصوّف پر مشتمل ہے۔

بغیر عشق دنیا نہ حق سر جیا کتے ذات نر نار پیدا کیا

### مجنوں کا لیلےٰ کے گھر آنا۔

یکایک وہ لیلےٰ کے در کے اوپر — پھسل کر پڑیا جا گڈھ کے بہت سر
دیکھی جھانکتے لیلیٰ نے کھڑکی میں سے — سمجھائی ہے مجنوں کو سد بدہ سنے
کہی ماں سوں جا یک گدا بے بصر — پڑیا ہے گدھی میں رو اپسے ضرر پر
کہی یوں میں جا کاڑ رس بیگ دیوں — ثواب ہووے تجکوں رضا تجھ سے یوں
کہیا ماں نے جا بیگ دے ہے ثواب — چلے دل خوشی سوں یو سن کر جواب

---

لائی پیر زن ایک صحرا منیں — وہ کیا ہو رووے پیش مجنوں گنیں
ایسا حال تیرا ہوا توں کہ — لیلیٰ باج مجنوں ہوا در کہ سہ
ہوا عقد لیلیٰ کا کنے رات کوں — ہوا جگ میں مشہور سیتا نین سوتوں
او ہے عیش و عشرت سنے رات دیس — ہوا کے دیوانا پھرا اپنا بیس
ہوا عقد لیلےٰ کا مجنوں سہنا — برہ کے اگن میں ایسکوں پہنا
یو سن کر اسی وقت کھونا پران — لیلیٰ کے نیوے یہ کتیں کماں

---

یہ مثنوی اب تک شائع نہیں ہوئی۔

(۳) تیسری مثنوی کے مصنف محبوب عالم ہیں۔ یہ مثنوی بھی نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں ہے۔ (۶×۸) سائز کے ۱۸۰ صفحے ہیں یعنی تقریباً ایک ہزار شعر پر مشتمل ہے سنہ ۱۱۰۶ھ میں اس کی تصنیف ہوئی ہے۔ چنانچہ مصنف نے اس کی صراحت خود کر دی ہے۔

سن یک ہزار ہور سو سال میں — ہوئے تھے چھ اس پے یراد پر آل میں

اس مثنوی کے مصنف محبوب عالم شیخ جیون کے نام سے موسوم تھے انھوں نے

چند ایک مذہبی قصّے لکھے ہیں۔ وِردنامہ ان کی ایک مشہور تصنیف ہے۔ اس کے اشعار پانچ ہزار سے زیادہ ہیں۔ عاجز کی طرح محبوب عالم پر بھی مذہبی رنگ چھایا ہوا تھا۔ ان کی مثنوی لیلیٰ مجنوں شائع نہیں ہوئی ہے۔ بطور نمونہ چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔ کتب خانہ سالار جنگ میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔

سو مجنوں سوں باتاں لگے بولنے — حقیقت کوں ساری لگے کھولنے
توں بیٹا ہے مجنوں ہے ابا نہیں — قراری نہیں کچھ تیری جان میں
کہ جس کا دِوانا ہو پھرتا ہے توں — بیاباں میں دوکھ سو کرتا ہے توں
سنیا نئیں تو لیلیٰ کا کیا کام ہتے — سو گل رات کوں پائے آرام جیسے
تو اوس کوں تو شو ملیا یار ہو — رہیا اوس سوں گل جوڑ دلدار ہو
تو لیلیٰ ہو عیش عشرت منیں — تو پھرتا ہے ناحق جو حسرت منیں
سنیا بات مجنوں رہیا دیہاں کہو — اوٹھا زندگانی سوں سے تنگ ہو
عجیب ہے خصم اور کریں گی نین — میں اوس کا ہو مجنوں لبسر ہے کہ میں
ہو سن بات مجنوں وہم میں پڑیا — وہم ہور دسوا اس اس غم میں پڑیا

---

## ۴۔ لیلیٰ مجنوں مصنف عبداللہ کمتر

اس مثنوی کی تصنیف ۱۱۹۶ھ میں ہوئی ہے، اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دو مرتبہ طبع ہوئی ہے۔

عبداللہ کے متعلق کوئی تفصیلی حالات معلوم نہیں ہوئے۔ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ واعظ بھی تھے۔ ان کے والد کا نام اسحٰق تھا، اور انھوں نے اس مثنوی کو ایک ماہ میں مکمل کیا۔

یہ مثنوی پہلی مرتبہ ۱۲۷۲ھ میں بمبئی میں طبع ہوئی ہے اور دوسری مرتبہ

اس کے بعد طبع ہوئی ہے۔ لیکن دوسرے ایڈیشن پر کوئی سنہ درج نہیں ہے۔ اس کے مطبوعہ نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ یہ کتاب قدیم زمانہ میں خاصی مقبول ہوگئی تھی۔

مثنوی کے پانچ سو سے کچھ زیادہ شعر ہیں۔

آغاز

الٰہی بخش مجھ کو نورِ وحدت | کہ جاوے دل سے میرے سب کدورت
الٰہی بخش تو عرفان مجھ کو | نبی کی لے مدد کہتا ہوں تجھ کو

---

"تاریخ تصنیف وغیرہ اور دکھنی زبان میں نظم کرنے کی وضاحت۔

یہ عبداللہ غلاموں بیچ کمترہ | الٰہی کردے دو جگ میں بہتر
زباں دکھنی میں اک قصہ سناؤں | ۱۱۹۶ ہجری میں سو لکھ کر سناؤں
وقت تھا ظہر کا تاریخ دسویں | رکھی میں پیر کے دن بات دل میں
میں عبداللہ واعظ ابن اسحٰق | خدایا بھیج میرے غم کا تریاق
شروع قصہ کہا دسویں صفر کو | سو دن تھا پیر کا وقت ظہر کو

---

بعض دیگر مقامات کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ قیس کا تعلیم کے لئے قاضی کے پاس جانا۔

کہا قاضی وطن ہم کو بتاؤ | تمھارا نام ہم کو کہہ سناؤ
کہا قاضی کو مجنوں نے پھر آکر | دیا نام و نشاں اپنا جتا کر
اسم ہے قیس اور مجنوں لقب ہے | وطن میرا شہر مکہ عجب ہے
کہا قاضی کیا ہم پر تو احساں | پڑھاؤں گا میں تم کو از دل و جاں

---

### لیلیٰ کا مدرسے رخصت ہونا

یہاں سے کر تو جا مجنوں کو رخصت | تو اب جاتی رہے گی ساری کلفت
کہا لیلیٰ نے مجنوں کو زباں سے | دعا مانگو تمھیں ہر دم خدا سے
ملوں گی آ کے تھوڑے دن میں تجھ سے | میرا تو باپ یوں کہتا ہے مجھ سے
یہ کہتا ہے کہ مجنوں کو بچھاڑو | ہمارے ساتھ مجنوں تم نہ آؤ
نہ چلیو سنگ ہمارے اب یہاں سے | میرا یوں باپ کہتا ہے زباں سے
سنو یارو مگر لیلےٰ یوں بولی | زباں کو میں نے ہو رلا چار کھولی

---

### لیلےٰ کا باپ کے ساتھ جانا

چلی لیلےٰ پدر کے ساتھ روتی | آنسوں سے اپنے سینہ کو جو دھوتی
کسی بھی رات میں نیں نید کرتی | وہ مجنوں کو گھڑی سموں سو کرتی
ہوئی جس وقت لیلےٰ خوب بالغ | اس کا باپ آ کر کہتا مقابل
کہ یہی رہے سو مجنوں اپنے گھر میں | نہ کر لیلیٰ فکر تو اپنے دل میں
ہوتی خوش وقت وہ ساعت دو ساعت | گھڑی کے بعد جاتی اس کو راحت
وہ لیلیٰ رہ کر کرتی تھی نعرے | میرا مجنوں کہا یوں کر پکارے

---

(۵) لیلیٰ مجنوں مصنف مرزا محمد تقی خاں ہوس

اس مثنوی کا بھی ایک مخطوطہ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں ہے، جو (۶×۱۰ ½) سائز کے (۱۴۳) صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۱۹۸ھ میں یہ مثنوی تصنیف ہوئی ہے۔ ایک دوسرا نسخہ کتب خانہ آصفیہ (سنٹرل لائبریری حیدرآباد) میں ہے۔
مرزا محمد تقی خاں ہوس لکھنؤ کے شاعر تھے، دربار اودھ سے تعلق تھا۔ سعادت علی خاں

اور غازی الدین حیدر کے دربار میں باریاب تھے۔ ان کا دیوان بھی مرتب ہوا ہے اس کا ایک مخطوطہ نواب سالار جنگ کے کتب خانے میں ہے۔ ہوس کو اردو کے مشہور شاعر میر حسن سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اپنے استاد سے ایک سال پہلے ہی انھوں نے اپنی مثنوی لیلیٰ مجنوں مکمل کر دی تھی۔ میر حسن کی مشہور مثنوی سحر البیان ایک سال کے بعد یعنی سنہ ۱۱۹۹ھ میں مرتب ہوئی ہے۔ مگر سحر البیان کو جس طرح مقبولیت ہوئی اور میر حسن نے اس کی وجہ سے جو نام پیدا کیا وہ بات ہوس کو میسر نہیں ہوئی۔

موجودہ معلومات کے لحاظ سے شمالی ہند میں لیلیٰ مجنوں کی یہ پہلی داستان ہے۔ اس سے پہلے کسی شمالی شاعر نے اس عنوان پر کوئی مثنوی نہیں لکھی۔ اس کے برخلاف دکن میں چار مثنویاں قلمبند ہو چکی تھیں۔

ہوس کی مثنوی سے اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے کسی فارسی مثنوی کا ترجمہ کیا ہے یا یہ ان کی طبع زاد تصنیف ہے۔ نمونۂ کلام پیش ہے۔

| | |
|---|---|
| جلتے تھے اُدھر دو دوست افسوس | کرتا تھا یہ درد سے قدم بوس |
| تھامے تھی وہ بار بار دل کو | یاں ذرہ نہ تھا قرار دل کو |
| لوگوں کے اُسے ہزار تھے خوف | رسوائیِ عشق سے یہ بے خوف |
| خاموش وہ ڈر سے اپنے کرکے | کرتا تھا یہ بات شور کرکے |
| گر آئینہ اُس کو کوئی دکھاتا | یہ آپ کو خاک میں ملاتا |
| آخر کئی بار پاس آکر | کہنے لگے اس طرح سنا کر |
| اے خاک رہ دیارِ لیلیٰ | اے عاشقِ بے قرارِ لیلیٰ |
| اُلفت کا ہے جرم تیری گردن | درپے ہیں ہزار دوست دشمن |
| کر ترک رہ و مقام لیلیٰ | بدنام ہے تو بنام لیلیٰ |
| یہ کہتے ہوئے بصد خرابی | لائے اُسے گھر تلک شتابی |

پھر بولی یہ لے کے نام مجنوں / اے راہ نورد کوہ ہامون
اے باغ و بہار زندگانی / کس کس سے کہوں یہ غم بیانی
اے حامل کوہِ درد و الفت / اے بستۂ رشتۂ محبت
کس سمت کروں تلاش تیری / کس جا پہ ہے بود باش تیری
کس شغل میں اس قدر ہے مشغول / کیا یاد تری مجھے گئی بھول
کرتی تھی یہ گفت گو کہ ناگاہ / جاتا تھا چلا کوئی سرِ راہ
کچھ شعر وہ طبع زاد مجنوں / پھر سننے لگا تھا جس کا مضموں
اے دوست تو اپنا مکھ دکھا دے / بیمار کو داروئے شفا دے
تا چند ترے لئے مروں میں / کس طرح سے زندگی کروں میں
تو سرو بہار و باغ میں ہے / یاں خار ہی دل کے داغ میں تھے

---

ہوس کی لیلیٰ مجنوں ۱۸۹۶ء میں مطبع نامی لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔ یہ نواب سالار جنگ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ اس کی دوسری اشاعت ہے۔

(۶) چھٹی لیلیٰ مجنوں بھی دکنی میں لکھی گئی ہے۔ اس کے مصنف غلام اعزاز الدین خاں المتخلص بہ نامی ہیں۔ دربار ارکاٹ سے ان کو مستقیم جنگ کا خطاب ملا تھا، اور عمدۃ الامراء نے اپنے دربار کا ملک الشعراء مقرر کیا تھا۔ ان کے والد کا نام حامد علی خاں تھا جو گوپامؤ (اودھ) کے باشندے تھے۔ رئیس ارکاٹ انور الدین خاں بھی گوپامؤ کے تھے۔

نامی کی ولادت ۱۱۸۱ھ میں ہوئی۔ غلام علی تاریخی نام تھا۔ عربی فارسی کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ اپنے وقت کے مشاہیر علما یعنی مولوی حافظ محمد حسین اور مولانا محمد باقر آگاہ وغیرہ سے اکتساب علم کیا تھا۔ ۱۲۴۰ھ میں نامی کا انتقال ہوا۔ ان کی

حسب ذیل تصانیف ہیں۔

شیریں خسرو۔ لیلیٰ مجنوں۔ سلیمان نامہ۔ قصہ بنارس۔ وفات نامہ نبی۔ دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ نامی قادر الکلام شاعر تھے۔ کئی ہزار شعر ان کی یادگار ہیں۔

نامی کی لیلیٰ مجنوں (۸ ½ × ۵ ½) سائز کے ۱۸۳ صفحات پر مشتمل ہے ۱۲۱۳ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اشعار کی تعداد دو ہزار ہے۔ چنانچہ ان امور کی صراحت بھی مصنف نے خاتمہ پر کردی ہے

| | |
|---|---|
| ہے تر و تازہ یہ جو بستانِ عشق | نامِ اُس کا ہے بہارستانِ عشق |
| میں کیا جب اس کے بیتوں کا شمار | پایا گنتی میں برابر دو ھزار |

"بہارستانِ عشق" سے ۱۲۱۳ھ تاریخ نکلتی ہے۔ کتب خانہ سالارجنگ میں اس مثنوی کے دو مخطوطات ہیں۔ ایک نسخہ کی کتابت ۱۲۷۲ھ کی ہے اور دوسرے کی ۱۲۹۷ھ۔ آخر الذکر نسخہ مصور ہے۔ دکن اسکول کی ۳۶ تصاویر موجود ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ میں بھی اس مثنوی کا ایک نسخہ ہے۔

نصرتی نے اپنی مثنوی "گلشنِ عشق" کے عنوان کو اشعار میں قلم بند کیا ہے اسکی پیروی دکن کے بعض دیگر شعراء نے بھی کی ہے۔ نامی نے بھی اس طرح مثنوی کے عنوانات اشعار میں لکھے ہیں۔ چنانچہ لیلیٰ مجنوں کے آغاز کا عنوان اس طرح لکھا ہے۔

| | |
|---|---|
| کون کر سکتا ہے حمدِ کردگار | عقل ہے مجنوں جہاں لیلیٰ و نہار |
| ہوش و فہم و وہم اور ذہن و ذکا | اس محل میں سر بسر ہیں نارسا |

---

مثنوی میں اولاً حمد ہے پھر نعت۔ اس کے بعد معراج کا بیان اور مناجات۔ مناجات کے بعد اپنے بادشاہ عمدۃ الامرا کی مدح اور ستائش ہے۔ پھر اپنے

بچوں حیدر حسین اور احمد حسین کو مخاطب کیا ہے، اور علم حاصل کرنے کی رغبت دلائی ہے اس کے بعد نفس مضمون شروع کیا ہے۔

نامی نے نظامی گنجوی کی لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ کیا ہے۔ اس سے پہلے قطب شاہی دور میں عاجز کے ہاتفی کی لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ کرنے کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ نامی کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

جب کئے ہیں قیس کو لیلیٰ سے دور — کوہ غم سے ہو گیا دل اس کا چور
اُس کی دوری سے زبس بیکل ہوا — اُٹھ گیا پردہ حجاب و شرم کا
صبر کی طاقت نہیں باقی رہی — بس گئی ہے دل میں آ صورت وہی
کچھ رہا سے ڈر اُسے استاد کا — بیقراری دل کی ظاہر کر دیا
مدرسے کو دیکھ خالی یار سے — مارتا ہر بار سر دیوار سے
بیٹھتی تھی جس جگہ پر وہ نگار — اُس جگہ آنکھوں کو ملتا بار بار
دل کو پڑھنے سے اوٹھایا ایک بار — رونے لاگا ہر گھڑی بے اختیار

---

از قضا جب مرد لیلےٰ کا ہوا — عشق مخفی تھا سو سب ظاہر ہوا
قیس کا دم مارتی تھی بے دھڑک — یہ چلا ہے خون دل سینہ تڑک
ایک مدت سے تھی جو دل میں دبی — آہ کے بارسے بڑکانے لگی
باپ کا ڈر تھا نہ ماں کا تھا لحاظ — اُٹھ گیا اپنے پرائے کا لحاظ
تن نہانے کا نہ لنگی کا خیال — کھانا پینا ہو گیا جی کا وبال
تن بدن کی کچھ نہیں سدھ بدھ رہی — ایک عالم کی ملامت سب سہی
دل نہیں لگتا کہیں اوس کا ذرا — کیوں کہ دل میں غم تھا دلبر کا بڑا

---

قیس و لیلیٰ کے ہوئے تب چار آنکھ
ہو گئے دونوں کے پھر خونبار آنکھ

دیکھ کر آپس میں بے ہوش ہوئے
دید کے نشہ سے خاموش ہوئے

دو گھڑی کے بعد آئے ہوش میں
بھر گئے ہیں دوستی کے جوش میں

پہلے پوچھی لیلیٰ یوں اے دوستدار
کیوں گزرتی تھی تری لیل و نہار

کس طرح رہتا تھا تو صحرا کے بیچ
کیوں بسر کرتا تھا اس خاک کے بیچ

ایسے جنگل میں تھی کیا تیری خوراک
کس نمط تھا با دل سو چاک چاک

تھا ترا اس دشت میں غمخوار کون
ایسی تنہائی میں تیرا یار کون

قیس نے بولا کہ اے دلبر مری
جب سے دل میں جا گئی الفت تیری

کوئی بن حق کے میرا ساتھی نہیں
خلق کی صحبت مجھے بھاتی نہیں

---

مثل شبنم چشم کو نمناک کی
جیب کو مانند گل سو چاک کی

پھاڑ پیراہن کو ہو گئی بے قرار
ڈال کر کفنی گلے میں ایک بار

---

(۷) لیلیٰ مجنوں مصنفہ حیدر بخش حیدری۔

اس کی تصنیف ۱۲۱۴ھ کلکتہ میں ہوئی ہے۔ حیدر بخش حیدری فورٹ ولیم کالج کے مترجمین میں شامل تھے۔ ان کا حال مؤلف ارباب نثر اردو نے بصراحت قلم بند کیا ہے۔ موصوف کی صراحت سے واضح ہوتا ہے کہ حیدری نے دیباچہ لیلیٰ مجنوں لکھا تھا۔ اگر دیباچہ حیدری کا تھا تو پھر یہ بحث پیش ہوتی ہے کہ اصل کتاب کس کی تصنیف تھی۔ مگر اس کا کوئی تذکرہ ارباب نثر اردو میں نہیں ہے۔ چونکہ یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری، اس لئے کوئی مزید صراحت نہیں کی جا سکتی۔

(۸) لیلیٰ مجنوں مصنف شیر محمد خاں ایمانؔ

یہ بھی دکن ہی کی تصنیف ہے۔ شیر محمد خاں حیدرآباد کے مشہور شاعر تھے، جن کی کئی ایک تصانیف ہیں۔ ایمان نے لیلیٰ مجنوں کو ایک مستقل تصنیف کی حیثیت نہیں دی ہے بلکہ ان کی ایک جداگانہ داستان ہے جس میں اُنھوں نے اولاً شیریں خسرو کی داستان لکھی ہے، اس کے بعد لیلیٰ مجنوں کی داستان لکھی ہے۔ دونوں داستانوں کا انجام بتانے کے بعد اپنی داستان کا انجام بتایا ہے۔ لیلیٰ مجنوں ۳۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

نمونہ ملاحظہ ہو۔

اپنے دل کی تجھے کہوں میں ۔۔۔ دیوانۂ عشق قیس ہوں میں
تھا ملکِ عرب میں اک جوانمرد ۔۔۔ .. .. .. منتخب فرد
اللہ نے دیا تھا مال موفور ۔۔۔ تھا سید عامری سے مشہور
خلاقِ جہاں نے بعد مدّت ۔۔۔ فرزند کیا اُسے عنایت

---

لیلیٰ سے کہو خجل نہ کیجیو ۔۔۔ خالی اُلفت سے دل نہ کیجیو
پھر باپ تے ساتھ لے پسر کو ۔۔۔ آیا نومید اپنے گھر کو
سوچے ناچار بہر تدبیر ۔۔۔ ڈالے مجنوں کے پا میں زنجیر
مجنوں اک شب تمام جاگا ۔۔۔ زنجیر کو توڑ گھر سے بھاگا
پہنچا جس دم لو آدمی نجد ۔۔۔ کرنے لگا رقص و فرحت و وجد
لیلیٰ جس دم ہوئی ہے ہشیار ۔۔۔ مجنوں تھا اگرچہ نقش دیوار
ڈال اُس کے گلے میں ہاتھ اپنے ۔۔۔ لایا خیمے میں ساتھ اپنے

---

(۹) لیلیٰ مجنوں ۔ اس کا مصنف نظیر اکبرآبادی ہے، جو اردو کا مشہور شاعر ہے مگر اپنے زمانے میں عوامی شاعری کے باعث "بدنام" رہا ۔ نظیر کا نام ولی محمد تھا۔ دہلی میں تولد ہوا اور نادر شاہ کے حملے کے وقت صغیر سن تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے وقت آگرہ چلا گیا۔ اس لئے اکبرآبادی مشہور ہے ۔ ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۰ء) میں اس کا انتقال ہوا۔

نظیر کی شاعری عوامی شاعری ہے ۔ اس کو کردار نگاری کا اچھا ملکہ حاصل تھا ۔ یہ پرگو شاعر ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ دو لاکھ شعر کہے تھے ۔ مگر ان کے کلام کا بڑا حصہ تلف ہو گیا ہے۔

نظیر نے لیلیٰ مجنوں بھی لکھی ہے ۔ اس کی تصنیف کا سنہ معلوم نہیں ۔ اس کی یہ مثنوی مختصر ہے ۔ صرف ۹ صفحے ہیں ۔ دو مرتبہ شائع ہوئی ہے ۔ ایک مرتبہ ۱۸۸۷ء میں طبع ہوئی ہے ۔ اور دوسری مرتبہ طباعت کا سنہ نہیں ہے ۔

کتب خانہ سالار جنگ میں دونوں موجود ہیں ۔ نظیر کی لیلیٰ مجنوں کا نمونہ یہ ہے۔

پہلے تو حمدِ خالقِ ارض و سما لکھوں
بعد اوس کے پھر میں نعتِ شہ انبیا لکھوں

---

پیدا ہوا تھا قیس جب اپنے پدر کے گھر
ماں باپ کو ہوئی تھی خوشی سب سے بیشتر

کنبے کے لوگ بیٹھے تھے باہم سب آن کر
اک دھوم مچ رہی تھی خوشی کی اِدھر اُدھر

چومے تھا باپ قیس کی ہر لحظہ چشم و سر
رکھتے تھے ہاتھوں ہاتھ چھاتوں اسے گرچہ بیخطر

ماں بھی لئے پھرے تھی اوسے اپنے دوش پر
فرزند کی خوشی میں لٹاتی تھی سیم و زر

لیکن وہ ماں کی گود میں آ کر نہ سوتا تھا
ہر وقت شور کرتا تھا ہر لحظہ روتا تھا

مادر تھپک تھپک کے سلاتی تھی بار بار
پھرتا تھا باپ فال دکھاتا بچشم زار
تعویذ ڈالتا تھا گلے بیچ بے شمار
لیکن اُسے قرار نہ آتا تھا زینہار

---

دکھ پانے والے لڑکے جو دنیا میں آتے ہیں
لچھن سب اُن کے پہلے ہی پہچانے جاتے ہیں
لڑکا بڑا یہ عاشق سرشار ہوئے گا
محفل میں عاشقوں کی نمودار ہوئے گا
مجنوں کے رونئیں رونئیں میں لیلی اگئی سما
لیلی کے بند بند میں مجنوں بھی بھر گیا
چاہت کے ان سے کام بہت نیک ہوگئے
دونوں میں کچھ دوئی نہ رہی ایک ہوگئے

---

نظیر کی مثنوی دو بار طبع ہوئی ہے۔ اس سے اس کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔

(۱۰) لیلی مجنوں۔ مصنف میر تجلی۔

اس کا ایک مخطوطہ سالار جنگ کے کتب خانہ میں ہے۔ یہ مثنوی شائع نہیں ہوئی ہے۔ سائز ۹ ½ × ۶ ½ صفحات ۲۵۳ سطر ۱۱ تاریخ تصنیف ۱۲۴۱ھ ہے۔

میر تجلی دہلوی میر محمد حسین کلیم کے فرزند اور میر تقی میر کے بھانجے تھے مصحفی نے اپنے تذکرہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں سے تجلی کو تلمذ حاصل تھا۔ تجلی نے ایک دیوان مرتب کیا تھا۔

تجلی بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے نظامی کی فارسی لیلی مجنوں کو دیکھ کر اپنی مثنوی قلمبند کی ہے۔ اور خود کو اردو میں لیلی مجنوں کی داستان کا پہلا مصنف قرار دیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ان سے پہلے سات مثنویاں لیلی مجنوں کے لکھی جا چکی ہیں، اور نظامی کی لیلی مجنوں کا ترجمہ بھی نامی نے کر دیا تھا۔ لکھنؤ میں ہوس نے اپنی مثنوی لیلی مجنوں لکھ دی تھی۔ غالباً تجلی کو ان کا علم نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے

اپنے آپ کو اردو میں لیلیٰ مجنوں کا پہلا مصنف تصور کر لیا ہے۔

تجلی کی لیلیٰ مجنوں کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ اس نام کی دوسری مثنویوں سے زیادہ ضخیم ہے۔ تین ہزار سے زیادہ شعر ہیں۔ سالار جنگ کے کتب خانہ کا نسخہ مصور ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

هوتی جوں مہ چار دہ دن بدن
کہ یعنی ہوا چار دہ سالہ سن

صبا لے چلی اس گلی لو کی بو
نہیں ایک سو بلکہ ہر ایک سو

پڑا جلوۂ حسن کا اُس کے شور
یہ شہرت گئی خلق اپنی شور شور

اور اس عاشقِ زار کا حال سن
گرفتار مجنوں وہ پامال سن

ہر ایک دل میں ہے اس کی خوبی کی دھوم
ہر اک سر میں شورش کا اس کی ہجوم

---

سخن سب اطبا نے سن سن لیئے
لگے کہنے ہے سخت سودا اسے

یہ بہتر ہے فصد اس کی گر لیجئے
دوا اور کچھ تب اسے دیجئے

اسی وقت فصاد حاضر کیا
بٹھا ہاتھ میں ہاتھ اس کا دیا

لیا اس نے نشتر کو جوں ایک بار
ہوا قیس بے تاب بے اختیار

کرے اشک مردم سے جیسے گریز
گریزاں ہوا اس سے یہ اشک ریز

لگا کہنے مجھ پہ کرو مت ستم
میرے جسم لائق نہیں یہ الم

---

ہوا قبرِ لیلیٰ پہ جب دم گذر
گرا اس کے اوپر وہ خستہ جگر

گلے لگ کے تربت سے گریہ کناں
تخاطب زمیں سے یہ کہنا کہ ہاں

کہ اے ارضِ مادر تو عالم کی ہے
تجھی سے بنا اہلِ عالم کی ہے

بنا تجھ سے یہ قالبِ مستعار
پھر آخر تجھی میں ہے اس کو قرار

مجھے تیری خدمت میں ہے التجا  اسی جا دے آغوش میں اپنا جا

---

(۱۱) مرقع لیلیٰ مجنوں ۔ مصنف مرزا محمد ہادی رسوآ ۔

ناول " امراؤ جان ادا " کے مشہور مصنف مرزا محمد ہادی رسوآ جو لکھنؤ میں ایک عرصے تک فلسفہ کے پروفیسر رہے اور حیدرآباد کے دارالترجمہ میں بھی اُنھوں نے ترجمہ کا کام کیا تھا۔ اس ڈرامہ کے مصنف ہیں یہ منظوم ڈرامہ ہے۔ اس میں پانچ ایکٹ اور ۲۳ سین ہیں، اصل ڈرامہ کے شروع میں ایک دیباچہ نثر میں ہے۔ یہ ڈرامہ ۱۸۹۵ء میں الناظر پریس لکھنؤ میں طبع ہوا۔ ۷۷ صفحے ہیں۔ دیباچہ کا مختصر اقتباس یہ ہے ۔

"حسن و عشق کے قصوں میں لیلیٰ مجنوں کا افسانہ (جس کو تاریخی واقعہ کی وقعت حاصل ہے ۔) عموماً مشرقی طبائع کو مرغوب ہے قیس کے دیوان کے مدون نے یہ تکلف کیا ہے کہ ہر غزل کے پیشتر اس موقعہ اور روداد کو بھی بیان کر دیا ہے جہاں پر اس غزل کا انشا واقع ہوا۔ یہ دیوان بجائے خود ایک تاریخ قیس کی سوانح عمری کی معلوم ہوتی ہے۔ گو اس میں شاعرانہ مذاق کو بہت کچھ دخل دیا گیا ہے ۔ میں ان واقعات کو کلیتہً اختیار نہ کرنے پر مجبور ہوا، اس لئے کہ اکثر مضامین اس دیوان میں ایسے ہیں جو ہمارے ملک اور نیز فارسی کے شاعرانہ مذاق کے بالکل مخالف ہیں پھر بھی حدالامکان اکثر واقعات اسی دیوان سے لئے ہیں"

اس اقتباس سے واضح ہے کہ رسوآ صاحب نے اپنے ڈرامہ کو کسی فارسی اور اردو داستان سے مرتب نہیں کیا بلکہ عربی دیوان سے مواد اخذ کیا ہے۔ اس لئے اس کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے ۔

رسوا کے اس ڈرامہ کو فن ڈرامہ کی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔
چنانچہ اس کے متعلق "اُردو میں ڈرامہ نگاری" کے مصنف نے حسب ذیل صراحت کی ہے۔

"مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی ملک کے مشہور ادیب خیال کئے جاتے ہیں۔ آپ کو اردو ڈراموں کی زبان پر سخت اعتراض تھا اور ہمیشہ اس کی فکر کیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک ڈرامہ "مرقع لیلیٰ مجنوں" پیش کیا، لیکن ڈرامہ پورے کا پورا نظم میں لکھ کر وہی پرانی لکیر کا تتبع کیا کہ موضوع بھی فرسودہ لیا اور اس خزینہ میں ایک مبتذل نقل عوام کے خوش کرنے کو ٹھوس دی۔ مرزا صاحب جیسے روشن خیال واقف کار اور سنجیدہ ادیب سے اس قسم کی لغزش واقعی تعجب خیز ہے۔" صفحہ ۲۲۹

یہاں ہم کو فنی نقطۂ نظر سے کوئی بحث نہیں ہے، صرف لیلیٰ مجنوں کی داستانوں سے بحث ہے۔ رسوا کی لیلیٰ مجنوں کو اردو میں اس لئے اہمیت دی جاتی چاہیئے کہ رسوا نے اس کو فارسی ماخذوں کے بجائے عربی سے اخذ کیا ہے۔ فارسی کا درمیانی واسطہ نہ ہونے سے اس داستان کو ایک خصوصیت حاصل ہوگئی ہے۔

رسوا کے ڈرامہ کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

نہ وہ جلوہ ہے نہ وہ یار ہے — نہ وہ باغ ہے نہ بہار ہے
نہ وہ شہر ہے نہ وہ یار ہے — نہ وہ کوچہ ہے نہ وہ بام و در
اسی دشت ہجر کو چل دلا — کہ نہ پردہ فاش ہو یار کا
ابھی اور کچھ دنوں صبر کر — . . . . . . . . . . .
نہ اس سے کچھ کہا نہ سنا — شب غم کا کہا نہ گلا
نہ نکلا منہ سے کچھ بھی دلا — ہوئے یوں محو حسن و ادا
کون پوچھے فلک سے کہ کیا — سنانے سے ہمیا رہو گا بھلا

نہ دم بھر بھی دیکھ سکا — کیا ظالم نے ہم کو جدا
مرض تقدیر نے وہ دیا — کہ ناپیدا ہے جس کی دوا
مقدر میں وصال نہ تھا — کہ بالکل بے اثر ہے دعا
ہوئی دل کو پسند بلا — نہ بھایا کچھ یہ تھا بھلا
مجھے دل سے اپنے گلا — کسی کی نہیں ہے اس میں خطا

---

(۱۲) حسین میاں ظریف تخلص اوریجنل تھیٹریکل کمپنی کے ڈرامہ نگار تھے۔ جن کو رونق بنارسی کے بعد اس تھیٹریکل کمپنی نے اپنا ڈرامہ نگار مقرر کیا تھا۔ ظریف کی طبیعت میں بڑی روانی تھی۔ انھوں نے اس کمپنی کے لئے کئی ڈرامے لکھے بتیس سے زیادہ ڈراموں کے نام مصنف "اردو میں ڈرامہ نگاری" نے بتائے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں "شیریں فرہاد"، "گل باصنوبر" وغیرہ کے ساتھ "لیلیٰ مجنوں" کا ڈرامہ بھی شامل ہے۔

افسوس ہے کہ مجھے یہ ڈرامہ ہمدست نہیں ہوا۔ اس لئے سوا نام کے اور کوئی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔

(۱۳) لیلیٰ مجنوں از حافظ عبداللہ

حافظ صاحب زمیندار بلیوڑہ لائٹ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی کے ڈرامہ نگار تھے اور اس خصوصیت میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ حافظ صاحب کے کئی ڈراموں کے نام سیّد بادشاہ حسین صاحب مؤلف "اردو میں ڈرامہ نگاری" نے لکھے ہیں۔ اُن میں "لیلیٰ مجنوں" بھی شامل ہے مگر یہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اس لئے سوائے نام کے اور کچھ صراحت نہیں کی جا سکتی۔

"فلم" کے دونوں دور یعنی خاموش فلم اور بولنے والے فلم میں لیلیٰ مجنوں کی

داستان کو فلمایا گیا ہے، مگر مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا یہ ڈرامے کن کے مرتبہ تھے اور کس نے ان کو ڈائریکٹ کیا تھا۔

جن داستانوں کا تذکرہ صفحات گذشتہ میں کیا گیا ہے اُن میں سے کسی مثنوی کی داستان کی تفصیل پیش نہیں کی گئی ہے۔ کیونکہ ان کی صراحت طوالت کا موجب ہوگی۔ مگر یہاں مختصر طور پر "لیلیٰ مجنوں" کی داستان کا لب لباب درج کیا جاتا ہے جس سے لیلیٰ مجنوں کے قصے کا پلاٹ واضح ہو سکتا ہے۔

ایک عرب کا قیس نام کا ایک لڑکا تھا۔ اس کے باپ نے پڑھنے کے لئے مکتب میں شریک کیا۔ چونکہ اس زمانے میں ابتدائی تعلیم مخلوط ہوتی تھی۔ اس لئے ایک لڑکی لیلیٰ نام بھی درس لینے مکتب میں آتی تھی۔ ان دونوں بچوں میں محبت ہوگئی۔ جیسے جیسے ان کی عمر زیادہ ہوتی گئی ان کی محبت بھی جوان ہوتی گئی۔ مدرسہ سے علیحدہ ہوگئے مگر محبت کی آگ تیز ہوگئی۔ قیس فطری شاعر تھا اور وہ اپنی محبوبہ کی شان میں کلام موزوں کرتا گیا۔ رفتہ رفتہ ان کے عشق کی داستان مشہور ہوئی۔ لیلیٰ کے باپ نے بدنامی کے خیال سے لیلیٰ کی شادی کسی دوسرے شخص سے کردی۔ قیس کو اس کی خبر ہوگئی اور وہ مجنوں بن گیا۔ حالتِ جنون میں جنگل کی راہ لی اور بیابان میں رہنے لگا۔ جنگل کے پرند اور چرند اس کے دوست بن گئے۔ لیلیٰ اگرچہ دوسرے شخص کے عقد میں تھی، مگر عشق کی آگ سے اندر ہی اندر جلتی رہی۔ اس آگ نے اس کو ختم کردیا۔ مجنوں کو اس کی اطلاع ہوئی اور وہ قبر پر آیا اور مجاور بن گیا۔ کچھ عرصے کے بعد مجنوں بھی جان کھو بیٹھا اور محبوب سے جا ملا۔

مختلف داستانوں کے اصلی پلاٹ کا خلاصہ یہی ہو سکتا ہے۔ مگر جذبات مختلف ہیں۔ لیلیٰ اور قیس میں نامہ و پیام ہوتے ہیں۔ ہجر و فراق کے گلے شکوے ہوتے ہیں۔ اس طرح داستان کو طویل کیا گیا ہے۔

لیلیٰ مجنوں کی داستان کی فلم جس قدر مقبول ہوئی ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ تلنگی وغیرہ زبانوں میں بھی اس کو فلمایا گیا ہے۔

امید ہے کہ اس تفصیل سے اردو میں "لیلیٰ مجنوں" کی داستانوں کا حال واضح ہو جائے گا۔

(رسالہ اردو ۱۹۵۶ء)

# محمد حنیفہ کے متعلق منظوم داستانیں

دکن میں ڈیڑھ دو سو سال کے عرصہ میں محمد حنیفہ کے متعلق کئی داستانیں مثنوی کی صورت میں لکھی گئی ہیں ۔ یورپ اور دکن کے کتب خانوں میں اس عنوان کا قلمی ذخیرہ موجود ہے ۔ ایک آدھ مطبوعہ مثنوی بھی میری نظر سے گذری ہے ۔ ان کی تفصیل موجب دلچسپی ہو سکتی ہے ۔ ان مثنویوں کو تین نوع پر تقسیم کر سکتے ہیں ۔

(ا) وہ داستانیں جن میں محمد حنیفہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا بدلہ لینے یزید سے مقابلہ کرتے ہیں ۔ طویل جنگوں کا سلسلہ چلتا ہے اور بالآخر محمد حنیفہ غائب ہو جاتے ہیں ۔

(ب) دوسرے وہ افسانے ہیں جن میں محمد حنیفہ کی زیتون شہزادی یا شیریں پری کے ساتھ لڑائیاں ہوتی ہیں اور بالآخر محمد حنیفہ بعد شادی کامیاب مدینہ کو واپس آتے ہیں ۔

(ج) تیسری قسم میں وہ قصے ہیں جن میں محمد حنیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ جنگوں میں شریک رہتے ہیں ، اور پھر محمد حنیفہ کے کارنامے سامنے آتے ہیں ، اور بعد فتح آپ مدینہ کو واپس ہوتے ہیں ۔

ان تمام افسانوں کو کوئی تاریخی اہمیت حاصل نہیں ہے ۔ البتہ صرف

امام حسینؑ کی شہادت اور محمد حنیفہ کی شخصیت صحیح ہے۔ داستانوں کی صراحت کے پہلے محمد حنیفہ کے متعلق کسی قدر وضاحت ضروری ہے۔ تاریخ سے واضح ہے کہ محمد حنیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فرزند تھے۔ ان کی والدہ کا نام حنیفہ تھا۔ اس لئے آپ محمد حنیفہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ شجاعت اور بہادری میں آپ کی شہرت تھی۔ اپنے بھائیوں خصوصاً حضرت امام حسن اور امام حسین سے خلوص اور محبت تھی۔

آپ کے متعلق ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب نے جو وضاحت رسالہ برہان دہلی میں کی وہ حسب ذیل ہے۔

"ان کا نام محمد تھا۔ ابن الحنیفہ کہلانے کا سبب یہ ہے کہ ان کی ماں ایک سندھی کنیز تھیں جن کا مالک بنو حنیفہ کے بڑے شہر یمامہ کا باشندہ تھا۔ سنہ ۱۲ھ میں جب خالد بن ولید نے مسیلمہ کا قصہ پاک کر کے یمامہ فتح کیا تو یہ خاتون مالِ غنیمت میں مدینہ لائی گئیں اور حضرت علی کے حصہ میں آئیں۔ (طبقات ابن سعد مطبوعہ لندن)

ڈاکٹر صاحب نے مزید جو حالات لکھے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے آپ کو جنگ و جدل اور معرکہ آرائی سے تنفر تھا۔ صلح، امن کو پسند کرتے تھے۔ معاویہ، یزید، عبد الملک سے آپ کو دوستی تھی، اور ان سے راہ و رسم تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی اپنے بھائیوں امام حسن اور امام حسین سے خلوص تھا۔ برادرانہ محبت سے رہا کرتے تھے۔

دکھنی مثنویوں میں ان کو امن پسندی کے خلاف ایک جنگ جو بہادر اور سورما کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

---

لہ رسالہ برہان بابتہ ماہ شوال سنہ ۱۳۷۹ھ)

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے کہ محمد حنیفہ کے متعلق تین قسم کی مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں۔ ان میں پہلی مثنویاں وہ ہیں جن میں محمد حنیفہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا بدلہ لینے کے لئے یزید سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اس موضوع پر جن شعراء کی مثنویاں ملتی ہیں وہ جنگ نامہ سیوک اور ظفر نامہ لطیف اور فتح نامہ محمود ہیں۔

اوّل الذکر کے متعدد نسخے میری نظر سے گزرے ہیں اور ثانی الذکر کا صرف ایک نسخہ دیکھا گیا ہے جو انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے، اور آخر الذکر کا بھی ایک نسخہ ہے جو کتب خانہ سالار جنگ میں ہے سیوک کی مثنوی۔ جنگ نامہ اور جنگ نامہ محمد حنیفہ سے موسوم ہے۔ اس کی تصنیف ۱۰۹۲ھ میں ہوئی ہے۔ تاریخ تصنیف کا شعر یہ ہے۔

یو سیوک تو ہجری کرے سال تھے
ہزار ایک نود دو کے اپرال تھے

اس داستان کا خلاصہ یہ ہے۔

حضرت علی نے اپنے فرزند علی اکبر کو ایک شہر کی طرف روانہ فرمایا جہاں انھوں نے اپنی بادشاہت قائم کرلی۔ علی اکبر کے بھائی محمد حنیفہ تھے۔ امام حسین نے اپنی شہادت کے وقت ایک قاصد کے ذریعہ محمد حنیف کو ایک خط روانہ فرمایا۔ اس خط میں لکھا گیا کہ امام حسن کو زہر سے یزید نے ہلاک کر دیا اور کربلا میں ان کو شہید کیا جا رہا ہے۔ اس کا بدلہ دشمنوں سے ضرور لیا جائے۔ امام حسین کے قاصد نے محمد حنیفہ کے پاس پہنچ کر خط پیش کیا۔ محمد حنیفہ خط کے مضمون سے آگاہ ہو کر فوج کے ساتھ یزید سے مقابلہ کرنے روانہ ہوئے۔ اثناء راہ میں معلوم ہوا کہ یزید نے مدینہ پر حملہ کر دیا ہے۔ آپ ادھر متوجہ ہوئے۔ اپنے دو بھائی طالب علی اور عاقل علی کو بھی آپ نے اپنی مدد کے لئے طلب فرمایا بڑی شدید جنگ ہوئی جس میں یزیدی لشکر کو شکست ہوگئی، مگر اس کے بعد یزید نے

مروان کی سرکردگی میں دوبارہ لشکرکشی کی اور روم، زنگبار اور فرنگ کے بادشاہوں سے بھی امداد طلب کی۔ وہاں سے بہت بڑی فوج یزید کی امداد کے لئے آئی۔ محمد حنیفہ کو ترکوں کے دو بادشاہ طوخان اور موخان نے مدد دی سخت جنگ ہوئی۔ میدان جنگ میدانِ حشر بن گیا۔ اسی اثنار میں محمد حنیفہ گرفتار ہو گئے۔ آپ کو یزید کے پاس روانہ کردیا گیا۔ یزید سے محمد حنیفہ نے مباحثہ کیا، اور آپ کو قید کردیا گیا۔ مگر آپ کے ساتھیوں نے آپ کو رہا کرالیا۔ اور اب پھر دونوں لشکروں میں مقابلے شروع ہوئے۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ لاکھوں آدمی مارے گئے۔ اس اثنار میں محمد حنیفہ کو غیب سے ایک آواز آئی کہ بندگانِ خدا کو کیوں قتل کیا جارہا ہے۔ غیبی آواز سن کر آپ گھوڑے پر سے اُتر پڑے۔ درگاہِ خداوندی میں دعا کی اور ایک غار میں چلے گئے۔ غار پر بجلی گری۔ اس کا راستہ بند ہو گیا۔ محمد حنیفہ کے غائب ہوتے ہی آپ کی فوج کو شکست ہو گئی۔ آپ کے بھائی علی اکبر کو ایک غیبی آواز سے محمد حنیفہ کا غائب ہو جانا معلوم ہوا اور آپ کے عزیز اور اقارب اپنے وطن کو واپس ہو گئے۔

یہ خلاصہ انڈیا آفس کے مملوکہ مخطوطہ کا ہے۔ اس کے مختلف نسخوں کے قصوں میں کسی قدر اختلاف بھی ہے۔

اس مثنوی کے مخطوطات جن کتب خانوں میں موجود ہیں ان کی صراحت حسب ذیل ہے۔

(۱) کتب خانہ انڈیا آفس لندن ایک نسخہ بلوم ہارٹ (۱۰۰ب)

(۲) کتب خانہ نواب سالار جنگ دو نسخے (ہاشمی ۷۶۶) (ہاشمی ۸۱۵)

(۳) کتب خانہ آصفیہ (سنٹرل لائبریری حیدرآباد) ایک نسخہ مثنوی ۵۴۳

(۴) کتب خانہ جامعہ عثمانیہ (سروری صفحہ ۹۶)

(۵) کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو دو نسخے ہیں (زور صفحہ ۵۰ جلد دوم صفحہ ۸۳)

اس مثنوی کا آغاز حسبِ ذیل اشعار سے ہوا ہے۔

الٰہی تو دانا ہے بینا غیب کا | تو ستار ہے ہر ایک عیب کا
کہیں بھوت ڈرتا ہوں یا بے نیاز | کہتے ہیں تو کرتا ہے پرسش نماز

مندرجہ صدر چھ نسخوں میں سے پانچ کو نامکمل کہا جا سکتا ہے، کیوں کہ آغاز حمد و نعت وغیرہ کے اشعار نہیں ہیں۔ صرف نواب سالار جنگ کے کتب خانہ کا ایک نسخہ (ہاشمی صفحہ ۷۶۶) میں حمد و نعت سے آغاز ہوا ہے۔ اولاً حمد ہے پھر نعت۔ اس کے بعد خلفائے راشدین کی منقبت۔ اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ یہ نسخہ نستعلیق میں لکھا گیا ہے، مگر خط نہایت زشت ہے۔ دوسرا نسخہ ہاشمی ۸۱۵ جو خوش خط ہے۔ اس نسخہ میں آغاز کے اشعار یہ ہیں۔

بحکمِ خداوندِ جاں آفریں | کہ ہے پاک او پاک رب العالمیں
محمدؐ کا صدقہ ہے سب پر سرس | دیا خاص عرفان کا خوش درس

اس نسخہ میں اول الذکر نسخہ کے آغاز کے تقریباً ۲۵ اشعار نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے عنوانوں کے اشعار بھی کم و بیش ہیں۔ اس طرح قصہ میں بھی تغیر ہو گیا ہے۔ بادی النظر میں دونوں نسخے علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتے ہیں مگر پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ دراصل دونوں ایک ہی ہیں۔

بلوم ہارٹ (مصنف کیٹلاگ اردو مخطوطات انڈیا آفس) نے اپنی کیٹلاگ میں اس امر کی صراحت کی ہے کہ سیوک کا جنگ نامہ محمد عاشق کی مثنوی قصہ محمد حنیف کا دکھنی ترجمہ ہے۔ مگر جہاں تک میں نے دونوں کا مقابلہ کیا ہے اس کے لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں جدا گانہ ہیں۔

اس موقع پر محمد عاشق اور اس کی مثنوی کی مختصر صراحت کر دی جائے تو نامناسب

نہ ہوگا۔

محمد عاشق کا نام دراصل شیخ نورالدین محمد عاشق تھا اور وہ ملّا صدرالدین محمد بن ابراہیم شیرازی (جو محمد عاشق زین العابدین سے بھی موسوم تھے) کا مرید تھا۔

ایتھے (مصنف کیٹیلاگ فارسی انڈیا آفس) نے اس امر کی صراحت کی ہے کہ اس کا دکھنی ترجمہ ظفرنامہ یا جنگ نامہ محمد حنیف کے نام سے ہوا ہے اور اس کا مصنف مفتاح العاشق ہے۔ محمد عاشق کی ایک تصنیف "چہہ سو عیش وطرب" بھی ہے۔ اسی ایتھے کی صراحت کو بلوم ہارٹ نے بھی انڈیا آفس کے اردو کیٹیلاگ میں نقل کر دیا ہے۔

ایتھے اور بلوم ہارٹ، دونوں کو یہاں سہو ہوا ہے۔ کیونکہ جنگ نامہ یا ظفرنامہ محمد عاشق کی مثنوی کا ترجمہ نہیں ہے۔ بلکہ بالکل علیحدہ قصہ ہے۔ چنانچہ محمد عاشق کی مثنوی کا خلاصہ یہ ہے کہ "ایک بادشاہ تھا اُس کی دختر نہایت حسین اور جمیل تھی۔ محمد حنیفہ اس کے حسن کا شہرہ سن کر اس کو حاصل کرنے روانہ ہوئے۔ اثناء سفر میں دیوؤں سے جنگ ہوئی اور بعد کامیابی محمد حنیفہ مدینہ کو واپس ہوئے۔ اس کے برخلاف سیوک کے جنگ نامہ کا جو خلاصہ پیش کیا گیا ہے وہ اس سے جداگانہ ہے۔ البتہ صفحات آئندہ میں جن کتابوں کا تذکرہ آئے گا اس کو محمد عاشق کی مثنوی کا ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔

۲۔ ظفر نامہ۔ جنگ نامہ سیوک کے ہم مضمون دوسری مثنوی ظفرنامہ ہے۔ اس کا مصنف غلام علی خاں المتخلص بہ لطیف ہے جس کو قزلباش خاندان سے تعلق تھا۔ قطب شاہی دور کا شاعر ہے۔ ۱۰۹۵ھ سیوک کی تصنیف کے تین سال بعد یہ مثنوی لکھی گئی ہے۔ چنانچہ اس کی تاریخ تصنیف کا شعر یہ ہے۔

سب لیو مثنوی ہوں بختم کتاب ہزار و نود پانچ میں باصواب

اس مثنوی کے تقریباً ۵۰۰ شعر ہیں۔ شاعر شیعہ مذہب کا پیرو تھا۔ بطور تفنن طبع شاعری کرتا۔ شاعری کے سوا وہ اپنی امارت شرافت پر بھی فخر کرتا ہے۔ اپنے

حیدرآبادی ہونے پر بھی تفخر کیا ہے۔ پُرگو شاعر تھا، کیونکہ ایک سال کے مختصر عرصہ میں اس ضخیم مثنوی کو جو پانچ ہزار پانچسو شعر پر مشتمل ہے ختم کیا ہے۔ اپنی مثنوی کے مقابلہ میں ۔ وہ شاہنامہ فردوسی کو ہیچ خیال کرتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ قرار دیا ہے کہ" شاہنامہ میں رستم اور اسفندار، سیمرغ کی داستان کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ظفر نامہ میں مردوں کی تعریف کی ہے۔ اور محمد حنیفہ کے حالات ہیں۔ ظفر نامہ میں جو جو باتیں پوشیدہ ہیں وہ روشن دلوں پر ظاہر ہو سکتی ہیں۔"

جنگ نامہ اور ظفر نامہ کا مضمون ایک ہی ہے، مگر اختلاف بھی ہے۔ چنانچہ ظفر نامہ کے قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ امام حسین نے اپنے بھائی محمد حنیف کو اپنا بدلہ لینے کے لئے لکھا، وہ اپنے ملک سے یزید کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے۔ اولاً مدینہ میں عتبہ بن ولید سے مقابلہ ہوا۔ پھر یزیدی فوج سے مختلف مقام پر مقابلے ہوتے رہے۔ یزید نے اپنی مدد کے لئے شاہ زنگ شاہ فرنگ کو طلب کیا اور محمد حنیفہ نے اپنے تین بھائیوں طالب علی، عاقل علی اور عقیل علی کو بلوایا۔ اس کے سوا تین ترک سردار نوخان۔ موغان اور عثمان بھی امداد کے لئے آئے۔ متعدد جنگیں ہوئیں جنہیں بہادری اور شجاعت کے نمونے پیش ہوئے۔ یزید کے پایہ تخت شہر دمشق کا محاصرہ کر لیا گیا، اور فتح کر کے امام زین العابدین کو یہاں کا بادشاہ بنایا گیا جو یہاں قید تھے۔ اس کے بعد محمد حنیف غائب ہو گئے جس کی وجہ سے امام زین العابدین کو بڑا رنج ہوا اور آپ اپنی جگہ اپنے بھائی علی اکبر کو دمشق کا بادشاہ بنا کر خود سلطنت سے دست بردار ہو گئے۔ سیاحت شروع کی۔ ایک روشن دل فقیر سے ملاقات ہوئی اور مدینہ آ کر علم الستادہ کرنے لگے اور محرم کی بناء قائم کی۔

اس اقتباس سے واضح ہو سکتا ہے کہ جنگ نامہ اور ظفر نامہ کے قصوں میں اشتراک ہونے کے باوجود اختلاف بھی ہے۔ ظفر نامہ کا آغاز یہ ہے۔

کروں ابتدا بسم اللہ تے — مدد منگ اسم اللہ تے
کہ اوّل کروں وصف اللہ کا — جنے جیو دیا سو لا الہ کا

اس مثنوی کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے۔ میں نے "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں نمونہ کلام وغیرہ پیش کر دیا ہے۔ (صفحہ ۱۵۵ تا ۱۷۴) اس مثنوی کا ایک نسخہ جامعہ عثمانیہ میں ہے۔ (سروری صفحہ ۹۶)

فتح نامہ۔ اس مضمون کی تیسری کتاب فتح نامہ یا ظفر نامہ مصنف محمود ہے جو ۱۲۰۴ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اس میں سیوک کے جنگ نامہ کے مماثل داستان نظم کی گئی ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں ہے جو ۱۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ ادارہ ادبیات اردو میں بھی ایک نسخہ ہے۔ اس مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوا ہے۔

کروں نامے کو حمد رب سوں آغاز — فصاحت میں رہوں دائم سرفراز

---

اس تفصیل سے واضح ہے کہ محمد حنیفہ کی داستانوں میں پہلی نوعیت کے جو تین قصے ہیں وہ اپنے مضمون کے لحاظ سے بڑی حد تک یکسانیت رکھتے ہیں۔ تاہم ان میں اختلاف بھی ہے۔ قطع نظر اس امر کے سیوک۔ لطیف اور محمود کی داستانوں کے اختلاف کے خود سیوک کے جو قلمی نسخے ہیں ان میں بھی اختلاف ہے۔ اشعار کی کمی و بیشی ہوئی ہے۔

(ب) محمد حنیفہ کی دوسری نوعیت کی داستانوں میں محمد حنیفہ کی جنگ یزیدی لشکر سے نہیں ہوتی بلکہ زیتون شہزادی اور شیریں پری سے ہوتی ہے۔ اس قسم کی جو مثنویاں میری نظر سے گزری ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) جنگ نامہ محمد حنیف و زیتون شہزادی۔

(۲) جنگ نامہ محمد حنیف و شیریں پری۔

(۳) شکار نامہ محمد حنیف۔

ان کتابوں کی مختصر صراحت کی جاتی ہے۔

(۱) "جنگ نامہ محمد حنیف و زیتون شہزادی" اس کے مصنف کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ حالانکہ یہ بمبئی میں دو مرتبہ طبع ہوئی ہے۔ اور دونوں طباعت کے نسخے بھی کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہیں مثنوی کے ایک ہزار سے زیادہ شعر ہیں۔ داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں محمد حنیفہ ایک دن شکار کے لئے جنگل کو تشریف لے گئے۔ آپ کے ہمراہ حضرت ابوبکر صدیق کے دو فرزند اور حضرت عمر کے دو فرزند بھی تھے۔ جب جنگل میں پہونچے تو ایک گرد و غبار نظر آیا، جب قریب ہوئے تو معلوم ہوا کہ یہ گرد و غبار ایک فوج سے پیدا ہوا ہے، اور یہ فوج زیتون شہزادی کی ہے جو اپنے کنیزوں کے ساتھ شکار کو نکلی ہے۔ محمد حنیفہ اور زیتون شہزادی میں جنگ ہوئی اور محمد حنیفہ شہزادی کے قیدی ہو گئے۔ مگر آپ کے رفقاء نے رہائی دلائی۔ زیتون شہزادی اپنے شہر کو واپس ہوئی اور مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لئے اپنے والدین سے اجازت لے کر روانہ ہوئی۔ ادھر محمد حنیفہ اپنی ناکامی سے شرمندہ ہو کر تنہا زیتون شہزادی سے لڑنے روانہ ہوئے۔ اثنا راہ میں پھر دونوں کا مقابلہ ہوا۔ محمد حنیفہ نے شہزادی کو گھوڑے کی زین سے اٹھالیا اور زمین پر چھوڑ دیا۔ شہزادی نے کہا میں اس شخص سے شادی کرنے کا ارادہ کی تھی جو مجھ کو زیر کرے۔ محمد حنیفہ نے جواب دیا جب تک میں بادشاہِ روم پہ فتح حاصل نہ کرلوں واپس نہیں ہوسکتا، اور نہ شادی کر سکتا ہوں۔ زیتون شہزادی مدینہ کو روانہ ہوئی اور محمد حنیفہ شاہِ روم سے لڑنے آگے بڑھے۔ شاہِ روم سے مقابلہ ہوا اور محمد حنیفہ کو دھوکے سے ایک کنویں میں گرا دیا گیا۔ ادھر شہزادی زیتون ان کی تلاش میں روانہ ہوئی۔ درمیان میں ایک سمندر حائل ہو گیا۔ جہاز کے ذریعے سمندر کو پار کیا گیا۔ حضرت علی بھی محمد حنیفہ

کی مدد کو روانہ ہوئے اور آپ سے بھی شاہِ روم کی لڑائی ہوئی۔ شاہِ روم مسلمان ہوا اور محمد حنیفہ کی شادی زیتون شہزادی سے ہوئی۔ اب سب لوگ کامیاب مدینہ کو واپس آئے۔

اس مثنوی کا ایک مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ میں ہے اور سنٹرل لائبریری حیدرآباد میں تین نسخے ہیں۔ اس مثنوی کے مصنف کا نام ظاہر نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ مثنوی شائع ہوگئی ہے۔ ایک آدھ نسخہ سے وفتی تخلص کا قیاس ہوتا ہے۔ مگر ہنوز تحقیق کرنی ہے۔ اس مثنوی کی تاریخ تصنیف بھی معلوم نہیں ہوئی۔ اس کا آغاز ان اشعار سے ہوا ہے۔

الٰہی دو عالم کا کرتار توں — دو نو جگ کا پیدا کرنہار توں

کیا اپنی قدرت تھے خلقت ظہور — زمیں آسماں ہور ملائک و حور

جو انسان و حیوان و اجنان تمام — کریں یاد تج کوں خدایا مدام

یہ مثنوی دو مرتبہ بمبئی میں طبع ہوئی ہے۔ پہلی مرتبہ ۲۸۔ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں مطبع حیدری میں قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد نے طبع کیا ہے۔ دوسری مرتبہ ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں مطبع کریمی بمبئی میں قاضی عبدالکریم بن قاضی نور محمد نے طبع کیا ہے۔

(۲) ایک اور جنگ نامہ حنیف ہے اس کو "شیریں پری" سے بھی ملقب کیا گیا ہے۔ مصنف کا نام محمد تھا۔ اور اس کے باپ کا نام مخدوم حسین ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک شعر سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

کہ خادم فقیر کا محمد ہوں میں — سو فرزند مخدوم حسینی کا ہوں میں

اس مثنوی کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

الٰہی توں ستار ہر عیب کا — توں دانا ہے عالم میں ہر غیب کا

گنہ بخش بندیاں کا دہر گراماں    توں صاحب سبحان ہے بڑا مہرباں

---

اس مثنوی کے قصے کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے ایک مرتبہ رومیوں سے جنگ کرنے کے لئے حضرت علی کو روانہ کیا۔ آپ کے ہمراہ محمد حنیفہ بھی تھے۔ حضرت علی کا ایک غلام مبشر نام تھا۔ اس کو آپ نے محمد بن حنیفہ کے ساتھ رکھا تھا۔ محمد بن حنیفہ ایک دن شکار کے لئے روانہ ہوئے۔ مبشر بھی ساتھ تھا۔ جنگل میں محمد حنیفہ راستہ بھول گئے اور رات کے وقت جنگل میں قیام کیا۔ رات کو ایک پہاڑ پر روشنی نظر آئی۔ محمد حنیفہ وہاں پہونچے۔ پہاڑ روشنی سے جگمگا رہا تھا اور ایک پری زریں لباس میں زرنگار تخت پر جلوہ گر تھی۔ محمد حنیفہ اس کو دیکھ کر بیہوش ہو گئے اور ہوش آنے پر اپنا حسب نسب بیان کیا اور راستہ بھول جانے کا واقعہ بیان کیا۔ اس حسینہ نے کہا کہ اس کا نام شیریں پری ہے اور وہ معتصم شاہ کی بیٹی ہے جو شاہِ اجنّا ہے۔ پھر محمد حنیفہ کو اس کے حصول کے لئے دیوؤں سے جنگ کرنی پڑی۔ کئی مصیبتیں جھیل کر بالآخر کامیاب مدینہ کو واپس آتے ہیں۔

کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں اس مثنوی کا ایک ایک نسخہ موجود ہے۔ فارسی سے یہ دکھنی میں منتقل ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

اتھا یو قصہ فارسی میں تمام    کیا نظم دکھنی پر یو خاص و عام

تاریخ تصنیف درج نہیں ہے۔ البتہ زبان کے اسلوب کے لحاظ سے اس کو ۱۱۵۰ھ اور ۱۲۰۰ھ کے قریب کی تصنیف قرار دینا صحیح ہوگا۔ کتب خانہ آصفیہ یعنی سنٹرل لائبریری اور کتب خانہ سالار جنگ کے نسخے میں جزوی اختلافات بھی ہیں۔ جس کی صراحت طوالت کا موجب ہوگی۔

۴۳۔ شکارنامہ محمد حنیفہ ۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ (سنٹرل لائبریری) میں ہے۔ اس کا مصنف محمد قادری معلوم ہوتا ہے جو دکن کا ایک مشہور شاعر تھا۔
مثنوی کا آغاز ان اشعار سے ہوا ہے۔

الٰہی توں قدرت کا غفار ہے ۔۔۔ دو جگ کے بندیاں کا تو ادھار ہے
ترے حکم سوں سب غفور الرحیم ۔۔۔ کہ حیّوم قیّوم صاحب کریم

اختتام میں مصنف کا تخلص اس طرح آیا ہے۔

محمد کہے صدق سوں قصہ تمام ۔۔۔ درود بر محمد علیہ السّلام
محمد پو بھیجو درود و سلام ۔۔۔ محمد کیا قادری یو کلام

اس مثنوی کے قصے کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ امام حسن اور امام حسین اور محمد حنیفہؓ شکار کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں محمد بن حنیفہ راستہ بھول کر بھائیوں سے بچھڑ گئے اور ایک جنگل میں پہونچے۔ جنگل میں ایک تر و تازہ باغ نظر آیا وہاں ٹھہر کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد ایک دیو ظاہر ہوا۔ محمد بن حنیفہ سے اس کا مقابلہ ہوا۔ آپ نے دیو کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد پھر کئی دیوؤں سے لڑائی ہوتی ہے۔ ہر جگہ محمد حنیفہ فتح یاب ہو کر پری سے شادی کرکے مدینہ واپس ہوتے ہیں۔

اس کے پہلے جس مثنوی کا تذکرہ ہوا ہے وہ دونوں قریب قریب ایک ہی نہج کی ہیں۔

مصنف کے متعلق کئی اور باتیں مثنوی سے معلوم ہوئے ہیں، وہ یہ ہے کہ ان کا خطاب شمشیر خاں تھا۔ ان کے ایک دوست محمد کاظم تھے۔ اور ان کا نام شیخ عمر تھا۔ قادریہ طریقہ میں مرید تھے۔

(ج) تیسری نوعیت کی مثنویاں وہ ہیں جن میں ز قوم بادشاہ سے جنگ کرنے حضرت علی روانہ ہوئے ہیں اور آپ کے ہمراہ امام حسن و امام حسین اور محمد حنیفہ ساتھ

ہوتے ہیں۔ داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرتؐ پر وحی نازل ہوئی کہ زقوم بادشاہ سے جنگ کی جائے۔ آنحضرت فوج لے کر روانہ ہوئے۔ بڑی جنگ کے بعد آنحضرت کو فتح ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے اپنے چار اصحاب کو لشکر دے کر روانہ کیا۔ حضرت علی کے ساتھ محمد حنیفہ بھی تھے اور زقوم بادشاہ کی لڑائی میں بہادری کے جوہر دکھائے اور بعد فتح مدینہ کو واپس ہوئے۔

سالار جنگ کے کتب خانہ میں اس مضمون کی دو مثنویاں ہیں۔ ایک کا مصنف داور شاہ خاکی ہے۔ اس کی تصنیف سنہ ۱۰۹۳ھ میں ہوئی ہے۔

ہزار اوپر نو دو دو اگل تھے سال　　　شمار اتنا رہے ہجرت کا حال

آغاز یہ ہے۔

خدایا ہے جگ کا توں پروردگار　　　کہ تجھ حکم سوں ہووے لیل و نہار

---

مصنّف کے نام اور تخلص کی صراحت۔

مرا ناؤں داور شاہ ہے گرچہ لیک　　　تخلص ہے خاکی غزلاں میں دیکھ

اس شاعر کا تخلص فتاحی بھی تھا۔

دعا سوں یاد فتاحی کوں کرنا　　　بندے کوں فاتحہ سوں نا بسرنا

اس مثنوی کا ایک نسخہ سالار جنگ کے کتب خانہ میں ہے۔ نمبر ہاشمی ۷۶۵ بلوم ہارٹ نے محمد عاشق کی جس فارسی کا ترجمہ قرار دیا ہے وہ یہی کتاب ہے۔ مگر یورپ میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔

اس مضمون کی ایک دوسری مثنوی اور ہے۔ اس کا مصنف قاسم علی ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے اور ایک نسخہ سنٹرل لائبریری میں ہے۔

آغاز یہ ہے۔

عطار و مجلس سنواریا تمام    سینا چہار شنبہ بہ سندیہ کام

---

اگرچہ بسم اللہ کے ساتھ ہی پہلا شعر ہے۔ مگر۔۔ ناقص اول۔۔۔۔ شاعر کے تخلص کا شعر یہ ہے۔

اے قاسم علی بس کر اس بات کوں    سمجھ خوب توں اپنی ذات کوں

(۳) اس مضمون کی تیسری مثنوی سنٹرل لائبریری میں ہے۔ اس کو ذیقوم نامہ۔ جنگ نامہ ذی قوم سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کا مصنف فضل بن محمد ہے اور ۱۱۹۴ھ میں یہ مثنوی تصنیف ہوئی ہے۔ تخلص اور تاریخ تصنیف کے شعر یہ ہیں ؎

فضل بن محمد دین پوسدا    سایہ مرتضیٰ اور رسول خدا

---

ہزار ایک سو نو دپر تھے چار    ہوئے تھے جو ہجری کے برس قرار

آغاز یہ ہے۔

کہوں حمد اوّل میں سبحان کا    جو پیدا کرہنار رحمان کا

سزاوار قدرت ہے بے نیاز    ہے ستار غفار بندہ نواز

---

شاعر کے حالات وغیرہ کے متعلق مزید تحقیق ہونی ہے اس لئے یہاں مختصر صراحت کردی گئی ہے۔

محمد حنیفہ کے متعلق ایک اور مثنوی بھی ملتی ہے۔ جس میں ان کی پیدائش سے حالات شروع کئے گئے ہیں۔ اس کا مصنف کوئی شاعر شیریں ہے۔ اس کا ایک نسخہ ادارہ ادبیات اردو میں ہے۔ (زور نمبر ۵۷۹) اس مثنوی کی تصنیف ۱۱۸۵ھ میں ہوئی ہے۔

ڈاکٹر زور صاحب نے حسن بیگ کے نام سے ایک جنگ نامہ کا تذکرہ کیا ہے۔

جلد سوم صفحہ ۱۷۲ اغالباً یہ سیوک ہی کا جنگ نامہ ہے جو ۱۰۹۲ھ میں مرتب ہوا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ محمد حنیفہ کے متعلق کئی داستانیں قلمبند ہوئی ہیں اور دکھنی شعرا نے کئی ایک مثنویوں میں ان کو ہیرو بنایا ہے۔ ان میں زیادہ تر ایسی مثنویاں ہیں جو کسی فارسی کا ترجمہ نہیں ہے۔

اس موقع پر ایک اور امر بھی قابلِ تذکرہ ہے ۱۰۹۲ھ میں سیوک نے جنگ نامہ حنیفہ کی مثنوی تصنیف کیا ہے اور داود شاہ خاکی نے بھی اسی سنہ میں اپنی مثنوی قصہ زنقوم بادشاہ قلمبند کیا ہے۔ دونوں میں محمد حنیف ہیرو ہیں۔ مگر ہر دو مثنویوں کی داستان میں فرق ہے۔ بلوم ہارٹ نے سہواً داود کی مثنوی کے بجائے سیوک کی مثنوی کو محمد عاقل کا ترجمہ بتایا ہے۔

(رسالہ مجلس حیدرآباد)

# اُردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ لطف النساء امتیازؔ کا دیوان اور مثنوی گلشن شعراء

دکھنی شاعری کا آغاز حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سید محمد حسینی سے تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر پہلا صاحبِ دیوان شاعر سلطان محمد قلی کو قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے اب تک کسی شاعر کا دیوان بدست نہیں ہوا ہے۔ اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ "ماہ لقا چندا" سمجھی جاتی تھی۔ اس کا دیوان پہلی مرتبہ ۱۲۱۳ھ میں مرتب ہوا۔ جو انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ "ھو اللطف الاعظمی" اس کے مرتب ہونے کی تاریخ ہے۔ اس دیوان کو ارسطو جاہ کے حکم سے نصیر الدین قدرتؔ نے مرتب کیا تھا۔ اس کا دوسرا نسخہ کتب خانہ آصفیہ (سنٹرل لائبریری حیدرآباد) میں ہے جو ۱۲۲۰ھ میں مرتب ہوا ہے۔

اب جدید انکشاف سے پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ لطف النساء امتیازؔ قرار دی جانی چاہیئے۔ کیونکہ اس کا دیوان ۱۲۱۲ھ میں یعنی چندا کے دیوان سے ایک سال پہلے مرتب ہوا ہے۔ لطف النساء امتیازؔ کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ نواب سالار جنگ کے کتب خانے میں ہے۔ میں نے اپنی مرتبہ فہرست میں دیوان امتیازؔ کے متعلق جو صراحت

کی ہے وہ یہ ہے۔

"امتیاز دکن کا شاعر ہے۔ ہم کو نہیں معلوم اس کا نام کیا تھا اور کس کا شاگرد تھا۔ کسی قدیم اور جدید تذکرے میں اس کا حال درج نہیں ہے۔ اختتامی شعر میں لفظ "کنیز" آیا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے امتیاز کوئی شاعرہ ہو"

اب خوش قسمتی سے امتیاز تخلص شاعرہ کی ایک ضخیم مثنوی ہمدست ہوئی ہے جو ہمارے دوست سید یٰسین علی خاں صاحب بی اے (علیگ) نبیرۂ حضرت امیر حیدر آبادی شاگرد داغ کی ملک ہے۔ اس مثنوی سے جو "گلشن شعرا" سے موسوم ہے واضح ہوتا ہے کہ امتیاز تخلص شاعرہ کا نام لطف النساء تھا، اور وہ شاہ عطاء اللہ کی مرید تھی۔ چنانچہ مثنوی کے اشعار ذیل ملاحظہ ہوں۔

| | |
|---|---|
| تو عشق حقیقی سے مدہوش ہے | شراب محبت سے بیہوش ہے |
| عطا وہ کئے معرفت کا کلام | عطاء اللہ سچ میرے مرشد کا نام |
| امین الدین اعلیٰ جو ہیں ان کے جد | وہ علم حقیقی کے ہیں مجتہد |
| جہاں تک زمیں ہے وہاں تک ہیں | ہیں سب اولیاء میں مثل نگیں |
| یہ قصے کو میرے تو مقبول کر | پڑھے اور سنے کوئی اہل ہنر |
| جو اس وہم میں دل نپٹ کٹ گیا | جو اک بی بی سنے میں مجھ سے کہا |
| جو لطف النسا سچ ہے تیرا ہی نام | ترے شعر کا شہرہ تا روم و شام |
| عجب قصہ نادر بنائی ہے آج | جہاں میں بہت اس کا ہوگا رواج |
| ترا جو تخلص ہے اب امتیاز | ہے سب اہل ہنروں میں تو شاہ باز |
| اب اہل کمالوں سے ہے التماس | ہے اصلاح کی دل کو جو میرے پاس |
| شفقت کر اصلاح بخشی تمام | اگرچہ ہیں ناقص کہی ہوں کلام |

تو کر ختم یہ قصہ اب امتیاز　　کر عاشق کو اب عشق سے سرفراز
یہ قصہ نہ قاری سے خالی کبھی
طفیلِ محمدؐ و آلِ نبی

لطف النساء امتیاز کی مثنوی چھ ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہاں اس کے دیوان سے جو حالات منکشف ہوتے ہیں اُن کی صراحت کی جاتی ہے۔

دیوان کے مندرجہ ایک مثنوی سے واضح ہوتا ہے کہ شاعرہ کی والدہ کا انتقال اُن کے بچپن میں ہو گیا تھا۔ اور باپ سے بھی جدائی ہو گئی تھی۔ دوسرے لوگوں نے اس کو پرورش کیا۔ امیر گھرانے میں پرورش ہوئی۔ شعر کہنے کا شوق بچپن سے تھا۔ چھتیس برس کے سن میں دیوان مرتب ہوا۔ چونکہ دیوان ۱۲۱۲ھ میں مرتب ہونے کی صراحت کی گئی ہے۔ اس لئے امتیاز کی پیدائش ۱۱۷۶ھ قرار دینا ہوگا۔ جب کہ نواب نظام علی خاں آصف جاہ کو حیدر آباد کو اپنا دار السلطنت قرار دئے ہوئے ایک سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔ امتیاز کی پرورش کرنے والے امیر کا نام ظاہر نہیں ہوتا۔ اس کے شوہر کا بھی اس کی جوانی میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔

دیوان سے واضح ہوتا ہے کہ امتیاز کو فارسی میں بھی اچھی قابلیت تھی اور وہ آصف جاہ ثانی کی مدح میں قصائد بھی پیش کرتی تھی۔ حضرت امین الدین اعلیٰ کے سلسلے میں شاہ عطاء اللہ کی مرید تھی۔ اس تفصیل کی تصدیق کے لئے دیوان کے مندرجہ مثنوی کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

کہ اس چرخ کج چرخ دیو یا علی　　کرو دور گردش برائے نبی
کیا شیشۂ دل کہیں بیس چور　　اٹھا جوش کر دل میں غم کا وفور
مشقت برس ہائے چھتیس کے　　سو یکبار کے ہائے وہ ہوئی گئے
جگر کے ہے دریا کو طوفاں ہوا　　جہاز آہ دل کا ہے لرزاں ہوا

گئی ٹوٹ ہے ہائے کشتیٔ جاں ہوا غم کے دریا کا غوطہ زناں
مرے دل پہ ڈالا ہے کوہ ہائے غم یہ حسرت سے کیا کیا کیا ہے گا ظلم
اگر ابتدا سے کہوں ماجرا تو دانا ؤں کا ہوش رہوے بجا
کیا چال کج رو سے کیسا عذاب جو آیا خم دل سے غم کے شراب
ہوں سرشار میں دمبدم زیادہ تر . . . . ہوتی ہمیشہ ہے لخت جگر
کہ اوّل جدائی کیا باپ ماں سوا برس کی بے شبہ تھی یہ جاں
تو پائی اسی عمر میں ماں کے فوت دی خلعت (؟) جب آگئے موت
ہوئی تو ہوا ایک عالم پہ غم مرے پہ جدائی کا غم تھا ستم
ہوا پرورش ہے غیروں کے سات رکھیں دائیاں نیک اور پاک ذات
ولیکن نہیں دودھ کسی کا پیوں فراق جبیں ماں سے ہر دم جھروں
کیئے پرورش وہ جو پالی تھی ماں زر و مال کیا تھا تصدق تھی جاں
نہ اولاد تھی اُن کو اور آل تھی وہ ہوتی تھی صدقے دیکھ حال تھی
تڑپنا و رونا مرا کام تھا ! نہ یہ مجھ کو معلوم انجام تھا
سبھی گھر کے تھے لوگ بے صبر و تاب کسی سے یہ دیکھا نہ جاتا عذاب
تو لیں ہاتھوں ہاتھ اور مجھ کو بہلائیں وہ خود آپ جاگیں سبھوں کو جگائیں
بنا آگے ضد سے ہی نازک مزاج چلے ضد کے آگے نہ کس کا علاج
ہوتا چار جو کچھ کہوں سو سنیں ! کروں میں تو جو سو سبھی وہ کریں
ہوا جب شروع آگے سال پنجم ! تو سونپے معلّم جو تھے خوش رقم
وہ بسم اللہ جب دھوم سے میں پڑھا ہوا بسم اللہ مرا رہ نما
ہوئی چند روز اس کسب میں جو صرف وہ قسمت کی حاصل ہوئی جن سے عصر
پڑھا او رلکھا کر سے قابل کیئے گویا چرخ کج رو کو قائل کیئے

مرے پالنے میں کئے نا قصور
ہزاروں اُٹھائے وہ دل کرکے چور

جو لازم تھا عمداؤں کے نسل کو
نجیبوں امیروں کی اولاد کو

وہ کیوں کر جو اس طور پالیں مجھے
ہزار آفتوں سے لئے تھے مجھے

وہ غم باپ وماں کا مجھے تھے شمار
قبیلہ ہے میرا تھا کچھ کم ہزار

تھے سب خوش غیور اور اقربا
غضب ناک عمدہ سبھی جا بہ جا

کہوں کیوں نہیں جور افلاک سے
چھڑایا یہ ملک اور املاک سے

کچھ یک اقربا آکے ملنے لگے
و نو سال کے بعد باپ آکر ملے

رہی ناشناسائی ان کی مجھے
کہ قبلہ ہے میرا یہ کوئی غیر ہے

غرض کیا کہوں اتنے مدت کا غم
کہ . . . . . سے ہوا مجھ پہ کیا کیا ستم

مقدر کا تھا جیتا لکھا پڑھا
تکا در جوانی پہ جب جا چڑھا

لڑکپن سے یہ شوق دل تے کیا
یہ کچھ شعر و اشعار کا مشغلا

فراست کدھر شعر فہمی کی ہائے
یہ ہے حوصلہ جس کا وہ کیا بنائے

نہ کچھ زمرۂ ہائے شعرا کے ہوں
نہ کچھ سلسلے میں ہے عقلا کے ہوں

یہ کر جلد جولاں و چابک خرام
تو دیوان کو ہے دیا انتظام

پڑے اس پہ نائل کی بھی گر نظر
کرے نکتہ چینی نہ اس کے مگر

نصیب امتیاز اب تجھے ہو یہی
ہووے وصل حق ہے بحق نبیؐ

مناقب قصائد مدح جو لکھا
مخمس و گر ریختہ جو ہوا

ہیں تعداد ابیات دیوان جو
ہوئے دو ہزار ساٹھ اور ایکسو

کیا سن ہے ہجری کہ جب میں عیاں
ہوئے یک ہزار دو سو پہ بارا جاں

مرتب تو دیوان اپنا ہوا
وپیش از لکھا دی ہے کیا کردیا

اور کئی اشعار ہیں۔ اس مثنوی سے دیوان کے اشعار کی تعداد اور سن تصنیف کا بھی اظہار ہوجاتا ہے۔ یعنی ۱۲۱۲ھ میں دیوان مرتب ہوا ہے۔

اگرچہ بعض اشعار سے امتیاز کا مرد کے تخلص ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے۔ مگر اشعار میں مذکر ضمیر کا ہونا زیادہ قابلِ لحاظ نہیں ہوتا۔

اسی مثنوی کے دو شعر سے امتیاز کے نام میں لطف شامل ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ یہ اشعار بھی پیش ہیں۔

| | |
|---|---|
| بھلا جو ہوا سو ہوا لطف سے | تو بہتر ہیں بزرگانِ نظر مہر سے |
| کہ اول تو تھا لطف سن ... | مبدل ہوا کیوں چھپا کر ہے راز |
| تو ہو باغبانِ نخل بند گلعذار | چلا ہے مگر چھوڑ کر یادگار |
| ہے مقصد یہی جان و دل کی مراد | بزرگوں سے ہو آخر میں وچ شاد |

یہ لاویں فہم میں دانائے راز
کہ کیوں لطف سے بن گیا امتیاز

آخری شعر سے صاف ظاہر ہوتا ہے لطف شاعرہ کے نام کا جز ہے۔ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ امتیاز کے شوہر کا نام اسد علی تمنا تھا۔ یہ وہی مشہور شاعر ہے جس نے "گلِ عجائب" کے نام سے تذکرہ شعرا کو ۱۱۹۴ھ میں مرتب کیا ہے۔ اس نے بھی آصف جاہ ثانی اور ارسطو جاہ کی مدح میں قصائد اور قطعات موزوں کئے ہیں۔ اس کا کلیات نایاب ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ تمنا کا انتقال ۱۲۰۴ھ میں ہوا ہے۔ شوہر کے انتقال کے وقت لطف النسا نوجوان تھی۔ اس کے آٹھ برس بعد ۲۶ سال کے سن میں اپنا دیوان

مرتب کیا ہے۔ امتیاز کی مثنوی سے جو روشنی پڑتی ہے اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کمیتِ شعر کا ہی تھا شہ سوار ۔۔۔ سخن کے اقالیم کا شہریار

کہ تھے شعراشعار کے کل زباں ۔۔۔ ہزاروں ہی رنگ کیے و تازہ بیاں

اُسی نے کہا شعر ہے آب دار! ۔۔۔ تھا عرصے میں شعرا کے چابک سوار

وہ سب خوبرویوں میں تھا نامدار ۔۔۔ کہ تھا کشورِ حسن کا تاج دار

شبابِ گلستاں ہوا نوبہار ۔۔۔ عجب سبز و سیراب وہ گلعذار

کہ تھا نازنیں خوش شکل نوجواں ۔۔۔ رکھے تیرِ مژگاں وا بروکماں

کہ جس کی نظر اُس پہ جا کر پڑی ۔۔۔ وہ کر آہ بے تاب ہو گر پڑی

اسی نوجواں کا تمنا تھا نام ۔۔۔ اسد تھا علی کا تھے روباہ رام

حسین و عجب نازنیں خوش جواں ۔۔۔ کہ جس پر ہوں آنکھوں سے میں خوں فشاں

جو گردش سے اس چرخ کے وہ جواں ۔۔۔ ہوا ہائے زیرِ زمیں مہ نہاں

---

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے امتیاز کے مرشد شاہ عطاء اللہ تھے۔ شاہ صاحب کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔

"شاہ عطاء اللہ شاہ امین الدین علی بیجاپوری کے اولاد اور خلفا میں سے تھے۔ تمام علوم عقلی اور نقلی، ظاہری اور باطنی کے ماہر تھے۔ آپ کی قابلیت اور تقدس کا اظہار آپ کو دیکھتے ہی ہو جاتا تھا حسن صورت اور حسن سیرت کے جوہر سے آراستہ تھے۔ آپ فقیروں کے لباس میں برہنہ سر اپنے ذاتی ہاتھی پر برآمد ہوتے تھے۔ ہر دیکھنے والا تعظیم سے جھک جاتا تھا۔

غفران مآب نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں بیجاپور سے حیدرآباد آئے اور یہاں کچھ عرصے تک قیام کیا، آصف جاہ آپ کے

بڑے معتقد ہو گئے تھے اور بڑی عزت کرتے تھے۔ محلات شاہی کی کئی بیگمات شاہ صاحب کی مرید ہو گئیں۔ اعظم الامرا ارسطو جاہ کو بھی آپ سے اعتقاد تھا اور آپ کی خدمت کرنے میں مصروف رہا کرتے۔

شاہ عطاء اللہ حیدر آباد سے کرنول گئے۔ نواب کرنول غلام رسول خاں آپ کا مرید تھا۔ کرنول ہی میں شاہ صاحب کا انتقال ہوا۔ مؤلف گلزار آصفیہ نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ اس نے اپنے شباب کے زمانہ میں شاہ عطاء اللہ کو دیکھا تھا۔ بڑے خوبصورت شخص تھے۔ "اللہ جمیل و یحب الجمال آپ پر صادق آتا تھا" (گلزار آصفیہ مطبوعہ ص ۳۹۸)

---

لطف النساء امتیاز کے دیوان میں ایک فارسی قطعہ تاریخ بھی ہے۔ اس پر دیوان ختم ہوتا ہے۔ یہ قطعہ حسب ذیل ہے۔

چوں از کنیز حضرت خاتون دریں زماں
اشعار تازہ جمع شد دل شگفتہ شد
از روئے یمن سال ہمایوں ایں کتاب
دیوانِ امتیاز بخوانید گفتہ شد

یہ دیوان پنجم جمادی ۱۲۲۳ھ کو لکھا گیا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے کہ امتیاز جس کا نام لطف النساء ہے پہلی صاحب دیوان شاعرہ تھی۔ چندا یعنی ماہ لقا کا دیوان پہلی مرتبہ ایک سال بعد اور دوسری مرتبہ آٹھ سال بعد مرتب ہوا۔ اس لئے امتیاز پہلی صاحب دیوان شاعرہ قرار دی جانی چاہیئے۔

اس موقع پر دیوان کی کسی قدر صراحت موجب دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اس لئے

دیوان کے متعلق چند امور لکھے جاتے ہیں اور کلام کا مختصر نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

یہ دیوان ۱۵۶ صفحے پر مشتمل ہے۔ جس میں سے ۹۵ صفحوں میں ردیف وار غزلیات ہیں بعض صفحوں پر دو اور بعض صفحوں پر تین غزلیں درج ہیں۔ غزلیات کے بعد فرد ہیں۔ فرد کے بعد پندرہ رباعیات اور پانچ قطعے ہیں۔ قطعوں کے بعد چند مخمس، اس کے بعد مسدس اور پھر حضرت امام حسینؓ کی جناب میں ایک عرضی۔ اس کے بعد امام کی مدح ہے اور مناقب ہیں۔ ان کے بعد آصف جاہ ثانی کی مدح میں دس قطعے ہیں قطعوں کے بعد چند قصیدے ہیں۔ پہلے قصیدے کا آغاز یہ ہے۔

شکر صد شکر خدائے کارساز بندگاں
کس مزے سے پھر گیا دل ہائے عالم شادماں
ہو خوشی سے بھی صدائے تہنیت سب خلق نے
شاد ہو پہنچائے نیکی از زمیں تا آسماں

گریز:-

صاف ہو رنگیں چمن دل کے بھی سب تازہ بہار
کیا شگوفے گل و غنچوں کے ہے لائی بر وہاں
ہر زباں گل ریز ہے اب صف شاہنشاہ میں
حق سلامت تا قیامت رکھ اسے شاہِ زماں

ایک دوسرے قصیدے کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہو کوئی شاہ شہاں یا محسن و جواد ہو! — زیر فرماں ہو کہ تیرا ہی مطیع منقاد ہو
دو جہاں کا ہو مقاصد پر ہے تو شاہنشہا — خاطر دل خواہ تیرے سب طرف سے شاد ہو
اب عنایت اور کرم سے ہے تیرے سر پر شہا — سایہ گستر مصطفےٰ و اللہ الامجاد ہو
رہو سے جاری تو ثنائے سیکھ منہ سے حشر تک — کیا فرشتہ کیا پری اور کیا ہے آدم زاد ہو

پوچھنا کیا ہیگا اوس کے جاہ و حشمت کا ایدل
فضلِ حق سے یہ ریاست جس کو مادر زاد ہو

جس طرح سے ہے بزرگی عرش کو فرحت کے ساتھ
سلطنت کو تیری ایسے طرز کی بنیاد ہو

ہے سکندر تو ہمارے عصر کا لاشک و ریب
عمر کا رشتہ تری جیوں رشتۂ فولاد ہو

تو سلیماں وقت آصف کار فرمائے جہاں
عدل و احساں سے ترے سارا جہاں آباد ہو

داد دہ فریاد رس ہے نائبِ خالق صحیح !
چاہیئے مخلوق پر تیرا کرم ایزاد ہو

ہیں جہاں تک انس و جاں مداح ہیں تیرے مدام
مدح میں تیری غزل کو مجھ سے لے ایجاد ہو

مدعا یہ ہے کہ پہنچے کعبۃ اللہ امتیاز
حرفِ رخصت اب زبانِ خاص سے ارشاد ہو

ایک اور دوسرے قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

جب کہیں آتا نظر وہ چہرۂ گلنار سے
سلسلہ ہوتا ہے برپا آہِ آتشبار سے

دیکھنے ہیں ہے مزہ یا کچھ دکھانا لطف ہے
جی میں آتا ہے کہ پوچھوں ساقیِ سرشار سے

ڈرتے ڈرتے کہہ دیا کہہ کر کہا دیکھو جواب
کچھ تو فرمائیگے تا معلوم ہو اظہار سے

سنتے ہی رو رو کہا سن لے ارے غافل مزاج
مجھ کو آتی ہے ہنسی تیرے یہ استفسار سے

جب تلک حس کے مزے سے آپ ہی واقف نہ ہو
کیا مزیداری ہے اس میں اب تو تکرار سے

یہ میئے گلگوں تو وہ ہے جو مکاں سے لامکاں
پار کر دیتی ہے پل میں چرخِ کج رفتار سے

کفر یا اسلام ہو کعبہ ہے یا تو دیر ہو
مدعا تسبیح سے حاصل ہوئے یا زنار سے

مقصد اپنے پر نظر رکھنا جہاں سے ہو حصول
بحث کرنے سے گذر اقرار سے انکار سے

مرشدِ وقت نے کہا ارشاد اس کے رمز سن
سب جہاں کے سارے میخواروں کے اس اسرار سے

یہ نکاتیں سن کے یارو جلد جا چوما قدم
راہ پر سمجھا اوسے دل کی زباں اقرار سے

امتیاز آوے جو کچھ دل میں ترے سو تو بھی کہہ
بندگی حاصل کہاں میں خانۂ خمار سے

طویل قصیدہ ہے اور کئی شعر ہیں جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے کہ امتیاز کے دیوان میں غزلیات، قصیدہ، رباعی کے ساتھ مسدس، مخمس، مثنوی قطعہ اور فردوات بھی ہیں۔ ایک مخمس ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

جاں نثاری درگہ والا پر چھوٹے سن سے کی
ہے تجھے شاد باش دل جا کر غلامی کن سے کی
صاحب کون و مکاں ہیں دوستی تو جن سے کی
اپنے فرمانے پہ جان ناتفاوت ان سے کی
ہوں باقرار زباں میں بندگی جس دن سے کی

ہوں تصدق شہ نجف پر معتقد پروانہ وار
ہوں میں ویسے شمع رو کا آہ یا رو جاں نثار
روشنی افزائے محفل دو جہاں ہے نامدار
جب تلک قالب میں دم ہے یہ کہوں گا میں پکار
ہوں باقرار زباں میں بندگی جس دن سے کی

ھَلْ اَتیٰ کی چہر خلعت تاجدار لَا فَتیٰ
قُلْ کَفیٰ کی کر کے مسند وہ علی مرتضیٰ
اِنَّمَا سے پا سرافرازی جو اس دنیا میں آ
کارفرمائے دو عالم ہیگا اے صاحب روا
ہوں باقرار زباں میں بندگی جس دن سے کی

---

ایک مسدس کے چند بند یہ ہیں۔

میں دل سے مصطفیٰ کا جاں فدا ہوں    محبِّ شبیر یزداں باصفا ہوں

جہاں میں بندۂ خیر النسا رہوں یہی ہر دم کہوں گا اور کیا ہوں

محبِ اہلِ بیت مصطفےٰ ہوں

غلامِ خاندانِ مرتضےٰ ہوں

پڑھوں جا کر یہی میں عارفوں میں کہوں گا بیٹھ کر اب عاشقوں میں

سناؤں جا کے بزمِ کاملوں میں کروں تکرار سارے شاعروں میں

محبِ اہلِ بیتِ مصطفےٰ ہوں

غلامِ خاندانِ مرتضےٰ ہوں

ڈروں رندوں سے نامسنوں سے کچھ بھی شرابِ شوق اُن کے یہاں نہیں پی

اگر آوے کوئی لینے میرا جی زباں سے یہ نکل جاوے گا تب بھی

محبّ اہلِ بیت مصطفےٰ ہوں

غلامِ خاندانِ مرتضےٰ ہوں

کرے ہے التیازؔ اب عرض تم سے دلِ پُر غم سے اور اس چشم نم سے

نکالو یا علی اس بحرِ غم سے ہر ایک دم میں رکھو جاری یہ دم سے

محبّ اہلِ بیتِ مصطفےٰ ہوں

غلامِ خاندانِ مرتضےٰ ہوں

---

اب غزلیات کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

جب سے صنم کے عشق میں دیوانہ بن گیا کعبہ سے دل مرا ہے نوبت خانہ بن گیا

مدّت سے گر سراغ جو خوش قامتوں کا آ مینائے دل مرا تو پری خانہ بن گیا

تو چشمِ پُر خمار کتنیں دیکھ اے صنم! نرگس کا ہر چمن میں ہے پیمانہ بن گیا

رہ رہ گئے روز و شب تری زلفوں کی یادیں پھٹ کر ہزار جا سے جگر شانہ بن گیا

رکھتا ہے امتیاز جو تو گُل رخوں سے شوق
عالم میں تیرے عشق کا افسانہ بن گیا

---

مجھ سے بسمل کو ذبح کر تو نے — آج قاتل بڑا ثواب کیا
امتیاز اب تراب لقب ہم نے — جاں فدائے ابو تراب کیا

---

مشفق ہے نہ ہمدم ہے کوئی ہے غمگسار اپنا
نہ ہے اب ساقی اپنا جام اپنا گلعذار اپنا

---

بہار آتی ہے گلشن میں کیا تاراج گھر اس کا
جفا ہے ان دنوں بلبل پہ ظالم باغباں ایسا

---

سینہ تری جفا سے معمور ہو رہا تھا — پر زخم دل میں ظالم ناسور ہو رہا تھا
اس جور اور جفا پر شکوہ کسی کے آگے — ہرگز کیا نہ گرچہ مجبور ہو رہا تھا
بیٹھا تھا جا چمن میں اک شب وہ چاندنی میں — پی کر شراب خوش ہو مخمور ہو رہا تھا
ساقی ولی مہیا محفل ہے عاشقوں کی — میرا بھی کچھ ذرا سا مذکور ہو رہا تھا
کہتے ہیں راہ دل سے ہے دل کو اس جہاں میں — جا دیکھوں کیا تماشا کچھ دور ہو رہا تھا
جب امتیاز جا کر اس باغیچے میں تنہا
گوشے میں اک مکاں کے مستور ہو رہا تھا

---

محو ہو دیکھ کے جلوے کو جمالِ ازلی — نقد جاں سب کی خریدی ہیں خریدار بنا

گر ریاست ہو مجھے ملکِ جنوں کی واللہ — عقل کو شہر بدر کردوں گنہ گار بنا

---

ہم سے نظروں کو چرا غیروں سے کرنا باتیں — رس بھری آنکھیں پھرا کر وہ رسیلا میرا
اس کا ثانی ہے کہیں سچ کہو یارو مجھ کو — اور سجیلوں میں کہیں ایک سجیلا میرا

---

منہ پہ جب زلفِ کج خمدار جھکا — صبحِ روشن پہ گویا ابر گھر آ جھکا

---

ہر گھڑی ہر آن دل میں امتیاز اب یاد کر — واقعہ کو کربلا کے لا نظر میں کر خروش

---

زلف عارض پہ تری سورۂ واللیل ضحیٰ — کس نے دیکھا ہے کبھی کفر میں اسلام کہیں

---

عمر کا شیشہ بہت نازک ہے یہ سنگِ اجل — جب کرے گا چور ہی تو ہم عزیزاں پھر کہاں
ساقیا محفل میں تیری کوئی دن مہماں ہیں — دیکھ لیں یہ گریۂ مینا جامِ خنداں پھر کہاں

---

آبِ رواں ہو سبزہ ہو اور گلعذار ہو — ساقی ہو جام اور بغل میں نگار ہو
ہووے جو رات چودھویں اور فرش چاندنی — ساغر بلوریں ہات صنم ہمکنار ہو
ہم لب بہ لب ہو آہ چھلکیں ایک جام پر — سب لوٹتے مزے کے جو ایسی بہار ہو

شاہِ دکن ہی رستمِ دوراں ہے امتیاز
شافیٔ شفا کو اس کے بھی پروردگار ہو

---

مدت سے وہ پیاسا ہے کر ذبح شتابی سے — لوہو سے میرے ظالم خنجر کو کر آلودہ

---

مچی کیا کھلبلی جب کہ کہا ساقی نے رندوں سے
تمھارے بزم میں اے میکشو صہبا کو بار آئی

---

اس سوادِ دل میں نہیں آتا ہے بہتر امتیاز
عشق کے سودے میں نقدِ دل گنوایا کیجئے

---

میرے جگر میں آہ و نالوں کی کیا کمی
پھر جستجو میں اُس کے خیالوں کی کیا کمی
صیاد منتظر ہے عبث صید دام کا
دشتِ جنوں میں آہ غزالوں کی کیا کمی
اُس لعلِ لب کی یاد میں جاتا ہے جی مرا
ورنہ مجھے تو اشک کے لعلوں کی کیا کمی
اُس شعلہ رو کے عشق میں اب امتیاز کو
تختِ جگر میں آگ کے چھالوں کی کیا کمی

---

ہم سے نہ پوچھے جو کبھی لذّتِ وصل
عمر گذری ہے ہمیں ہجر میں مرتے مرتے

---

نہ سمجھیں کفر کو کیا ہے نہ کچھ جانیں مسلمانی
ہمیں دیر و حرم یکساں عبث سب کو ہے حیرانی

---

شورِ صحرا میں مرے آنے کی کچھ دھوم سی ہے
عملِ قیس کے اُٹھ جانے کی کچھ دھوم سی ہے

---

زمیں سے آسماں تک جلوہ افروزی ہے آدم کی!
جو کوئی دیکھے اُس خاکی سے اب کیا کیا جھگڑتے ہیں

دو رباعیات ملاحظہ ہوں۔

چلا کر تیر مژگاں کو بھلایا ابرو کماں تو نے
کیا ہے دل ہمارا صید ناحق نوجواں تو نے
کہا یہ کون ہے جو اس طرح دیتا ہے جاں اپنی
گلی میں رات کو سن کر مرا شور و فغاں تو نے

---

شکر اللہ خانۂ دل عیش سے آباد ہے　　راحتِ جانِ جہاں ہو کر خوشی سے شاد ہے
شکرِ حق آتے ہیں اب نواب صاحب مہرباں　　چوطرف سے ہے ہجوم اور لیو مبارکباد ہے

---

ایک مخمس کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

وارث ہے دو جہاں میں جو تخت و کلاہ کا　　ہے شاہ بے نظیر وہ کیا عزّ و جاہ کا
نیں (نہیں) آسرا ہے اس کے بغیر از پناہ کا　　شافع ہے حشر میں جو ہمارے گناہ کا
کیا دل کشا مکاں ہے مری سجدہ گاہ کا

دل نے کیا تھا قول یہ روزِ الست میں　　رہوے گا ہو غلام یہ تا اپنے ہست ہیں
دیکھا ہے جس نے عالمِ بالا و پست میں　　جا کر جھکا ہے اُن کے قدم کے نشست ہیں
کیا دل کشا مکاں ہے مری سجدہ گاہ کا

---

دیوان کے خاتمے پر ایک فارسی غزل بھی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ لطف النساء کی فارسی قابلیت بھی اچھی تھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

شورِ دلم اے یار بہ ارض و سما فتاد　　. . . . . . . . . . .
حیرت ز بو و جاں چہ صد قیامت است　　مفہوم شد کہ دل ز دل لربا فتاد
پشت کہ خم شدہ فلک تیرہ روزگار　　شاید ز دست آہ من از عصا فتاد
عشق کہ داشتم ز جاں مخفی بدل　　در حیرتم چگونہ بعالم صدا فتاد
مارا کسے بعقدہ کشادن چہ حاجت است
کارِ تو امتیاز باہلِ عصا فتاد

---

اس دیوان کی کتابت ۵۔ جمادی الثانی ۱۲۲۳ھ ہجری کو ہوئی ہے۔ قدیم چمڑے

کی جلد ہے۔ اور قیاس یہ ہے کہ وہ اسی زمانہ یعنی ۱۲۲۳ھ کی ہے۔

امتیاز کی گلشن شعرا ایک ضخیم مثنوی ہے جو ہمارے دوست سید لیسین علی خاں بی اے (علیگ) نبیرہ حضرت امیر حیدرآبادی شاگرد حضرت داغ کی ملکی ہے۔ چونکہ یہ ایک نایاب مثنوی ہے۔ اور اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ کے اعلیٰ تخیل اور نتیجۂ فکر کی یادگار ہے اور آج تک گوشۂ گمنامی میں رہی ہے اس لئے اس کا تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثنوی (۱۲ × ۸) سائز کے ۴۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں ۱۵ سطریں۔ اس لحاظ سے چھ ہزار سے زیادہ اشعار ہوتے ہیں۔ اس مثنوی میں اولاً حمد نعت منقبت، اس کے بعد عشق کی تعریف ہے، اور پھر قصہ شروع ہو گیا ہے۔ اگرچہ قصہ زیادہ تر قدیم طرز کا حامل ہے مگر بعض امور میں دوسرے قصّوں کے برخلاف جدّت کی گئی ہے۔ قصہ کا لب لباب یہ ہے کہ ایک بادشاہ تھا جس کا نام فرخ بخت تھا وہ اپنی اچھی صفات سخاوت و مروت، عدل و انصاف کے باعث مشہور تھا۔ ایک رات جلسۂ عیش و نشاط منعقد ہوا۔ محفل رقص و سرود گرم ہوئی۔ دل آویز موسیقی اور دلکش رقص میں تمام رات بسر ہوئی۔ جب صبح ہوئی تو بادشاہ متفکر نظر آیا اور اس نے اپنی زبان بند کر لی کسی سے بات چیت کی اور نہ حکومت کے کاروبار انجام دیئے۔ تین رات اسی طرح گزر گئے۔ امراء اور وزراء پریشان ہو گئے اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ آخر بادشاہ کے چاروں وزیر حاضر ہوئے۔ اور یکے بعد دیگرے ہر ایک نے ایک داستان بیان کی (مثنوی کا بہت بڑا حصہ ان ہی داستانوں پر مشتمل ہے) ان داستانوں میں طلسم کشائی، دیو پریوں کے حالات قالب بدلتے ہوئے واقعات وغیرہ آتے ہیں۔ جب چوتھے وزیر نے اپنی داستان ختم کی تو بادشاہ نے زبان کھولی اور بیان کیا کہ اتنی بڑی سلطنت ہے مگر اس کا کوئی وارث نہیں یعنی وہ بے اولاد ہے۔ بادشاہ کے شادی کی فکر ہوئی اور ایک دوسرے ملک کے بادشاہ جس کا نام زبرجد شاہ کی

لڑکی کے لئے پیغام گیا مگر زبرجد شاہ نے رشتہ کو منظور نہیں کیا، اس لئے دونوں حکومتوں میں لڑائی ٹھن گئی۔ جنگ ہوئی، مگر پھر مصالحت ہوئی اور فیروز بخت کی شادی ہو گئی۔ اس شادی کے بعد لڑکا تولد ہوا جس کا نام درشہوار رکھا گیا۔

لڑکے کی پرورش اور تعلیم و تربیت ہوئی۔ جوان ہوا شکار کو نکلا شکار میں ایک ماہ جبین کو دیکھ کر عشق کا تیر جگر کے پار ہو گیا اور ادھر معشوق بھی بیقرار ہوتی رہی۔ اور بالآخر ملکۂ گوہر شب چراغ سے شادی ہوئی۔

مصنفہ نے بتایا ہے کہ افسانہ فرضی ہے۔ درحقیقت عشقِ حقیقی کی تفصیل کرنا ان کا مقصد تھا جس کو مکمل کیا گیا ہے۔ مثنوی میں حمد، نعت، منقبت کے بعد مناجات ہے۔ اس کے بعد اپنے دل کا حال لکھا ہے۔ اس کے ختم پر اصل داستان شروع کی گئی ہے۔

مثنوی کا آغاز یہ ہے۔

لکھوں کیا وصف میں اُس کبریا کا ہے صاحب عرش اور تحت الثریٰ کا

ثنا پر اُس کی ہے دل کو گوارا کیا ہے پل میں جس نے گیتی آرا

کیا قدرت کا جب گلشن نمایاں کروڑوں گل کیا اس نے خنداں

مناجات کے سلسلے میں مثنوی کے نام وغیرہ کی صراحت ہے۔

کریں اس کو پسند سارے سخن ور سخن میں خوب جرأت دے اے داور

نظر پھیریں جو اس پر ہوش منداں ظرافت سے نہ ہو ویں نکتہ چیناں

ہے اس میں عشق کا آغاز و انجام تب اس کا گلشن شعرا رکھے نام

کرے جو امتیاز اس مثنوی کا وہ پاوے ذوق اس کے معنوی کا

کہاں ساقی شتابی لا پیالے کہ جس میں بے خودی ہو وہ پیالے

ہمیں خواہش ہے اس مے کی اے ساقی رہے تا حشر مستی جس کی باقی

اپنے دل کی حکایت بیان کرنے کے بعد عشق پر خامہ فرسائی کی ہے۔ عنوان کو فارسی عبارت یا شعر میں لکھا گیا ہے۔ چنانچہ

حکایت در بیان حالتِ دل کہ شدہ است در فراقِ جاناں مانندِ بسمل

دلِ پرتاب دارم ماز عشق است

جگر خوں تاب دارم ماز عشق است

عشق کی تفصیل اور وضاحت میں ڈھائی سو سے زیادہ شعر کہے ہیں۔ اسی ضمن میں اپنے بادشاہ آصف جاہ ثانی اور ارسطو جاہ اعظم الامرا، وزیرِ اعظم کی تعریف کی ہے۔ اس کے بعد قصہ شروع کیا ہے۔

بادشاہ اور وزیر کی مدح کے چند شعر

جہازِ دل کی ہے میرے تباہی ۔۔۔ اماں دے بحرِ غم سے یا الٰہی

دلا شاہِ دکن کی کر تو تعریف ۔۔۔ رواں کر کلک در میدان توصیف

ہمارا شاہ وہ لاریب ہیگا ۔۔۔ سریرِ سلطنت کا زیب ہیگا

ہے دانائی میں وہ ضرب المثل ہے ۔۔۔ ارسطوئے زماں ہے بے خلل ہے

وہ شاہِ ہند کا یار وفادار ۔۔۔ امیروں کا وزیروں کا ہے سردار

رہے اعدا بذلت اس کی دائم ۔۔۔ رہیں وہ دوست اس کے شاد و خرم

وہ ہے روشن ضمیر و ناظمِ دہر ۔۔۔ ہے جس کے فیض سے آباد سب شہر

سلامت رہو لے شاہِ جہاندار ۔۔۔ سبھی مل کر کہو آمین ایک بار

اوسے ہے یک وزیرِ اعظم معظم ۔۔۔ ارسطو سلطنت کا حکم محکم

نوازش شہ کا اوس پر ہیگا بیحد ۔۔۔ نہیں شہ پاس عرض اوس کی کوئی رد

مخاطب اوس کو فرزندِ دل آویز ۔۔۔ کہ دل شہ کا مسرت سے ہے لبریز

فلاطوں جس کا شاگردِ دبستاں ۔۔۔ تو کا افہام میں ہیگا دو چنداں

دیا حق بات اوس کے اسم اعظم ... زیادہ کیا کہیے گا وصف ہے اتم
مجھے ایک نقل یاد آتی ہے یارو ... سنو اے عشق کے ہاتھوں کے مارو
میرا دل نفس کے اب دیں نے گھیرا ... فسانہ حسب حال ہیگا میرا
کروں تا سوز کو میں اوس میں ظاہر ... جسے ہو امتیاز اس پر کھلے سر

داستان آغاز ہوتی ہے۔

کہیں تھا ملک ایک نام عجوبا ... تھا بیشک وہ طلسماتی تماشا
جو نقاش ازل کلک قدرت ... کیا تھا کیا منقش اوس پہ ندرت
عجب جنت نشاں تھا وہ سراپا ... کہ بندہ کو تھا یکسر اچنبا
وہاں کے شاہ کو کیا خاص و کیا عام ... شہ فیروز بخت اوس کا کہیں نام
رعیت پروری میں تھا وہ یکتا ... جو لا ثانی جہاں میں عدل فرما
تھا تاج خسروی اُس پر سزاوار ... کیا تھا زیب شاہی جس نے اظہار
اوسے تھا جاہ و رفعت کا زبس اوج ... سپاہ اوس کی کئی تھی فوج در فوج
جو کچھ اسباب شاہی ہو جہاں میں ... تھا سو چنداں اوسے سارے جہاں میں
رہیں قربان سر دنیا کے شاہاں ... عدو تھا نام سن جیوں بید لرزاں
شجاعت اُوس کی تھی پر تیغ خونریز ... وہ اعدا پر مقرر تھی بلاخیز

...

اسی حالت میں آیا روز سیوم ... نہ تھی وہ حالت اول سے کچھ کم
اسی احوال میں اوس شاہ نے جب ... نہ کی گفتار سہ روز و سہ شب
کئے ایسا ہی خاص و عام غوغا ... قریب ہی یہ کہ کچھ ہو شہ بہ برپا
کہ آپس میں وزیران خردمند ... جو تھے وہ چار ذی عقل و ہنرمند
وہ جاکر پاس خدمت زمیں چوم ... کہے چاروں مچی کیا شہر میں دھوم

رعیت خلق میں ہے شور ایسا کوئی سن مدعی آوے تو بکا

اب وزرا کے قصے بیان کرتے ہیں جن میں پریوں اور طلسمات وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

کہ یہ دونوں وزیر ہوشہ سے رخصت کیے رنج سفر کو جی پہ راحت

چلا ایک ڈھونڈا باغ دل آرا پھرے تھا روز و شب صحرا بصحرا

دوجا تا دوسرا شہر صبا جو ہر ایک سے پوچھتا دو بدو ہو

کہ اے یارو کوئی پتا بتا نا مجھے شہر صبا کو ہے گا جانا

سنے شہروں کا اور قریوں کا عالم تعجب ہو کہیں واللہ اعلم

ہنیں نام ہے سینے شہر صبا کا کہ یہ روئے زمیں پر ملک ہیگا

جلوس بیاہ شاہانہ ہوا جب لگے ہیں باجنے باجے وہاں سب

تماشے تھے ہزاروں قسم کے واں تماشا بین لاکھوں جمع کروڑاں

کوئی کی دیوانے یارا لاکھ دیو کو بلا حاضر کیا تھا واں بھی سب کو

شکل اون کی متبدل کرنیا خوب رہا اون میں نہ کچھ اون کا رہے اسلوب

لباس وہ مکلل گہرے در بر چلے دو دو مرصع جھاڑ لے کر

سوا اون کے براتی اور باشان عظیم الشان مع امراء و اعیان

کوئی ناچنے والی سبھی آ بنائی وہاں مزے کا کیا سمایا

جب آتشبازیاں چھوٹی ہیں سات چمک چاند اور ستاروں کی ہوں بات

حلقوں کے ستارے جا سما پر کریں روشن زمیں کو وہاں سے کر

عجب گلریز کی گلریزیاں تھیں وہ ہٹ پھولوں کی دست و زباں تھیں

یہ چرخہ آسمان کا چرخ کیا یا جو دیکھا چرخیوں کا وہ سمایا

غرض دن اس تماشے میں ہی سب جائے بغل میں تازہ دلبر شب کو یک آئے

گذر گئے اس مزے میں چار دن تو یکایک کہ اوٹھا والا خبر دادیو

کرو اے مہ جبیں تو مجھکو رخصت ۔ ہو تم خورشیدِ افلاک محبت

نہیں چہتا ہوں تم سے دور ہونے ۔ یہ نقدِ عیش کو اب مفت کھونے

اگرچہ تم سے لذت بر نہ ہوتا ۔ غنیمت صرف صحبت کو سمجھتا

خدا جانے کہ گردش سر پہ کیا لائے ۔ فلک نیرنگیہاں کیا کیا ہے دکھلائے

میرے سے مکر و حیلہ کر کے تم سب ۔ کنیزاں بھیجتے خلوت میں ہر شب

پھر آگے دیکھتا ہے کیا مصیبت ۔ کیا طالع میں لکھتے ہوئی ہو راحت

یہ سن کر سب ہنسی سے کھل کھلائیں ۔ ادا سازوں نے کر تازہ ادائیں

کہیں اے شاہ تو والا فہم ہو ۔ تعجب یہ گماں اور یہ وہم ہو

تجھے نئیں کہہ چکے ہم سب ہیں تیرے ۔ یہ کیوں اندیشے تیرے دل کو گھیرے

بھلا دیکھیں کیسا ہے صاحب وفا ۔ سبب یار کے یہ جفائیں سہا

یہ حکم ہوتے دوڑے ہیں کئی چوبدار ۔ کئیں اب بچلی جلد صاحب وقار

سماع کر کہ خورسند لقا شاد ہو ۔ نکل قیدِ غم سے ہے آزاد ہو

سواری کا شاہانہ کر کر جلوس ۔ کہ آراستہ شاہ سا روم و روس

جلوس ہزاروں چلے مرد مال ۔ یہ مہ جلوہ افروز تھا درمیاں

شکوہِ بادشاہی نمایاں تھا ۔ سوز دلاں مہر رخشاں تھا

اوسے راستے میں خلق دیکھ کر ۔ کہے نسلِ یوسف میں یہ ہے مگر

وگرنہ یہ حسن آیا نظر ۔ پری نژاد یا ملک کے برقع بشر

کئی شمع اوپر ہے پروانہ وار ۔ ہزاروں کا جھومر ہوا ایک بار

گذر رستوں سے وہ دربار آ ۔ نظر کر شہنشاہ دنگ ہوے رہا

ملا اوٹھ کے تعظیم و توقیر کر ۔ بیٹھیا پاس اپنے اوسے تخت پر

کہا سن وزیر آہ دانائے دل ۔ مجھے عقدہ ایک آپڑا ہے اکیل

شتاب اس کو فرمائیے کہ شہا! ہے ہر مرض کے سات اوسکی دوا
سن اب خواب دیکھا ہوں میں یک مہیب گویا صعب بیماری مجھ کو نصیب
اوس آزار سے کھلتے کھلتے مرا جنازہ بنا خلق سب لے چلا
شہر کے ہویا ہر لگے دیکھنے مکاں خوب سا ہو جہاں گاڑنے
عجب شور و غوغا ہو یکبارگی تب عالم پہ ہو گئی ہے آوارگی
سو میت اکیلی میری آ گئی سپاہ و رعیت گویا بہ گئی
وہ دریائے طوفاں میں تھا ایسا شور کہ دشمن کتا اب تو دروازے توڑ
شہر میں پڑی لوٹ اور ہائے ہائے کسی کی نہ کچھ بات سمجھی ہے جائے
یہ سب ہوتے ہوتے صدا کیا اٹھی کہ اے بادشاہ ہائے رے ہائے رے
عجب صاحب عدل اور داد تھا ہے صد حیف کیوں تو بن اولاد تھا
مصیبت ہماری یہ ایسی پڑی ترا وارث ہوتا اگر اس گھڑی
سو القصہ اوس درشہوار پر قیامت ہر ایک آن تھا وقت حشر
کٹی رات وہ بھی خموشی کے سات نہ کر چشم وا اور نہ کر کس سے بات
کٹی شب سیاہی کو چل تار تار ہو چاک گریبان و صبح آہ مار
شمع صبح تک جلتی روتی گئی الم غم چشیدے کا لیتی گئی
وہ خلوت میں کئی دن گواندہ گئیں پڑی جان نا وزار وہ مہ جبیں
بہت خیر و خوبی سے آ اپنے گھر فقیر دل گداؤں کتیں دے کے زر
شب و روز عشرت کی نوبت بجی نقارے یہ نوبت عیش ڈنکا ہے دی
ہوئی پانچویں جمعی اوسی طرح سے سرور دل و جان کی فرح سے
یہ بعد از دو ماہ سبھی مفہوم کر ہوا نخل شمشاد جو بار ور
شہاں سارے ملکوں کے رخصت کو آئے بہت معذرت سے انھوں کو پہنائے

وہ فیروز بخت اور لکھراج شاہ | ہوئے سارے شاہوں کے تب عذر خواہ
کہے حرفِ رخصت نہ لو بر زباں | مقرر برس سے مجلس یہاں
کرو یہ بھی کہنا ہمارا قبول | رہے سے تمھارے ہے راحت حصول

غرض بڑی دلچسپ داستان ہے چھ ہزار سے زیادہ شعر کا مطالعہ مجھ جیسے عدیم الفرصت اور عمر رفتہ کے بس کی بات نہیں ہے جستہ جستہ مطالعہ سے جو باتیں معلوم ہوئیں وہ قلمبند کرادی گئی ہیں تفصیلی مطالعہ سے داستان کی پوری کیفیت واضح ہوسکتی ہے۔

مثنوی کے خاتمہ پر مصنفہ نے اپنے مرشد وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ چند شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں ؎

توجہ تو اب کر حقیقی طرف | تجھے ہووے کونین میں اب شرف
تصدق سے مرشد کی کروں دل لہ | جو دیکھے تو درگاہ پاک الہ
مجھے پیار کر بولے تب دستگیر | تو الفت میں دنیا کے مت ہو اسیر
تو عشقِ حقیقی سے مدہوش ہو | شرابِ محبت سے بیہوش ہو
عطا وہ کئے معرفت کا کلام | عطاء اللہ سچ میرے مرشد کا نام
امین الدین اعلیٰ جو ہے اُن کے جد | وہ علمِ حقیقی کے ہیں مجتہد
جہاں تک زمین وہاں تک امین | ہیں سب اولیاؤں میں مثلِ نگیں
دیوے عشق ہر سنگ دل کو خدا | خصوصِ عشق کا بخشے الہ
مجازی حقیقی سے ہے گرچہ دور | ہے ایسا دیں ایک دونو کا نور

مزید چند شعر کے بعد مصنفہ نے خدا سے پانچ باتوں کی استدعا کی ہے۔

مری عرض تجھ سات یہ ہے الاہ | ہیں مقصد میرے پانچ رہ تو گواہ
اوّل عشق سے اپنے کر سرفراز | میرے دل میں بھر دے سبھی اپنے راز
دُویا دمیں اپنے رکھ شب و روز | تڑپتی رہوں عشق میں با تعب و دز

سیوم دل کو دنیائے دوں سے چھڑا ‏ ‏ ‏ اور عالم کی الفت سے دل کو توڑا

چہارم یہ ہے عرض اے داورا ‏ ‏ ‏ میرے جتنے ہیں مقصدوں کو بر آ

ہے پنجم ۵ مجھے رکھیو کر کے کنیز ‏ ‏ ‏ رہوں سب کنیزوں میں ہو کر عزیز

ہو وے عبس پہ تیری نظر ذو الجلال ‏ ‏ ‏ او سے بخشے سب معرفت کا کمال

یہ قصے کو میرے تو مقبول کر ‏ ‏ ‏ پڑھے اور سنے کوئی اہل ہنر

جو اس وہم میں دل نپٹ گت گیا ‏ ‏ ‏ جو ایک بی بی سنتے ہی مجھ سے کہا

جو لطف النسا سچہ ہے تیرا ہی نام ‏ ‏ ‏ تیرے شعر کا شہرہ تا روم و شام

عجب قصہ نادر بنائے ہے آج ‏ ‏ ‏ جہاں میں بہوت اس کا ہو گا رواج

تیرا جو تخلص ہے اب امتیاز

ہے سب اہلِ ہنروں میں تو شاہ باز

## اختتام

اب اہلِ کمالوں سے ہے التماس ‏ ‏ ‏ ہے اصلاح کی دل کو جو میری پاس

شفقت کر اصلاح بخشی تمام ‏ ‏ ‏ اگرچہ میں ناقص کہی ہوں کلام

تو کر ختم یہ قصہ اب امتیاز ‏ ‏ ‏ کر عاشق کو اب عشق سے سرفراز

یہ قصہ نہ قاری سے خالی کبھی

طفیلِ محمد و آلِ نبی

یہ مثنوی کب تصنیف ہوئی اس کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ البتہ کتابت کی تاریخ حسبِ ذیل درج ہے۔

"تمت الکتاب بعون ملک الوہاب بید الفقیر حقیر سید محمد بدیع الزماں غفر الہ ذنوبہ واستر عیوبہ بتاریخ نہم شہر محرم الحرام سنہ ۱۲۴۳ ہجری روز جمعہ بہ اتمام رسید۔"

من نوستم انچہ دیدم در کتاب عافیت واللہ اعلم بالصواب

الٰہی ہر آنکس کہ ایں خط نوشت

عفو کن گناہاں عطا کن بہشت

اس تفصیل سے لطف النساء امتیاز کی مثنوی گلشن شعراء کا ایک خاکہ معلوم ہو جاتا ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ دکن کی شاعر خواتین میں ان کو بہمہ وجوہ فضیلت دی جانی چاہیئے۔ اس نے نہ صرف ایک طویل مثنوی اپنی یادگار چھوڑی ہے بلکہ کلیات مرتب کیا، جس میں ہر نوع کا کلام شامل ہے جس سے امتیاز کے کمالِ فن کا ثبوت ملتا ہے۔

لطف النساء امتیاز کا جو کلام پیش ہوا ہے اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امتیاز ایک باکمال پرگو شاعرہ تھی۔ اس کے تخیل کی بلندی، معانی کی گہرائی، نازک خیالی، اثر آفرینی کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔

جس زمانے میں لطف النساء نے اپنا دیوان مرتب کیا اُس وقت دکن میں احسن اللہ خاں بیان کا طوطی بول رہا تھا۔ اسد علی خاں تمنا، شیر محمد خاں ایمان، شاہ تجلی تجلی وغیرہ شعراء شاعری کے میدان میں دادِ سخنوری دے رہے تھے۔ ایسے زمانے میں امتیاز کا دیوان مرتب کرنا اس کے کمالِ فن کی دلیل ہے۔